جلد ۵ عدد ۲
شعبان ۱۳۵۳ھ

(رجسٹر نمبر آصفیہ ۱۲۰)
(رجسٹر نمبر ایم ۲۹۵۰)

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقایق فرقانی کا ذخیرہ

مرتّبہ

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (صہ)   بیرون ہند کے لئے (ؑشہ)   قیمت فی پرچہ ۸/

قیمت بلا جلد ... مجلد ...

ضخامت ۔۔ ۵۰۰ صفحات

الجہاد فی الاسلام

ٹائپ اسلامی مجلد عمدہ کاغذ

تالیف

ابو الاعلیٰ مودودی

کتاب کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لیے اس کے صرف ایک باب (باب ہفتم) کی فہرست مضامین ملاحظہ ہو:۔

جنگ اور تہذیب جدید

اصطلاحی تحقیق۔ بین الملی قانون INTERNATIONAL LAW کی حقیقت۔ بین الملی قانون کے ماخذ۔ بین الملی قانون کا شعبہ جنگ۔ مغربی جنگ کا اصلی قانون ضروریات جنگ۔ قوانین جنگ کی ناپائداری۔ فوجی اور قانونی گروہوں کا اختلاف۔

مقصد جنگ۔ جنگ عظیم کے اسباب و وجوہ۔ قوموں کی جتھہ بندیاں۔ شرکائے جنگ کے پوشیدہ مقاصد۔ دوران جنگ میں خفیہ معاہدے۔ جنگ کے بعد قوموں اور ملکوں کی تقسیم۔ مغرب کی حق پرستی کا معیار۔ قیام امن اور نزع سلاح کی تحریکیں۔ جمعیت اقوام۔ تحریم جنگ اور نزع سلاح کی جدید تجاویز۔

قوانین جنگ۔ مغربی قوانین جنگ کی تاریخ۔ ہیگ کے سمجھوتے اور ان کی قانونی حیثیت۔ اعلان جنگ۔ اہل قتال COMBATANTS اور غیر اہل قتال کا امتیاز۔ وجوہ امتیاز۔ امتیاز کا احساس کب پیدا ہوا۔ دور جدید کی جنگ میں امتیاز ناممکن ہے۔

اہل قتال کے حقوق و فرائض۔ قواعد حرب کی پابندی، امان، اسیران جنگ، مجروحین و مرضی، مقتولین، تباہ کن اشیاء کا استعمال، جاسوسی، حیلہ و خدیعۃ فی الحرب، استعمال غیر اہل قتال کے حقوق و فرائض: غیر مقاتلین کا اولین فرض، غیر مقاتلین کی عصمت، غیر محفوظ آبادیوں پر گولہ باری، عنوۃ فتح ہونے والے شہروں کا حکم، احتلال OCCUPATION اور اس کے قوانین، غارت گری اور تباہ کاری، غیر جانبداروں کے حقوق و فرائض: غیر جانبداری کی تاریخ، دور جدید میں غیر جانبداروں کی حیثیت، محاربین BELLIGERENTS کے فرائض غیر جانبداروں کے متعلق، غیر جانبداروں کے فرائض محاربین کے متعلق، آخری تبصرہ، مغربی قانون کے مقابلہ میں اسلامی قانون کے وجوہ ترجیح۔

دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمائیے

فہرست مضامین

ماہ شعبان ۱۳۵۳ھ جلد ۵ عدد ۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اسلامی تعلیم و تربیت کے لحاظ سے نیم پختہ یا بالکل خام نوجوانوں کے مذہبی خیالات پر مغربی تعلیم و تہذیب کا جو اثر ہوتا ہے اس کا اندازہ، ان تحریروں اور تقریروں سے ہو سکتا ہے جو اس قسم کے لوگوں کی زبان و قلم سے آئے دن نکلتی رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک تازہ نمونہ ملاحظہ ہو۔

سید مقبول احمد صاحب صوبہ متحدہ کے ایک مسلمان گریجویٹ جو غالباً ڈپٹی کلکٹر بھی ہیں، کچھ مدت ہوئی کہ چین و جاپان کی سیاحت کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ ان کا سفرنامہ گورکھ پور کے رسالہ "ایوان" میں شائع ہو رہا ہے۔ ہانگ کانگ کے حالات تحریر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"ہمارے ساتھ جتنے چینی مسافر ہیں وہ انتہا کے بلانوش اور شرابخوار ہیں۔ سور کا گوشت تو اُن کی جان ہے ...... اب میں نے عیسائیت کی ترقی کا راز سمجھا چین اپنے قدیم مذہب کی پیروی کو نئی تعلیم کے ساتھ عار پاتا ہے۔ اس کو اسلام قبول کرنے میں تامل نہ ہوتا اگر وہ اس کو سمجھتا ہوتا مگر اسلام کم از کم اس کی تمام مرغوب غذا سے محروم کر دیتا ہے۔ چار و ناچار وہ عیسائی ہو جاتا ہے۔ ......

کچھ عجب نہیں کہ آیندہ چین کا سرکاری مذہب عیسائیت ہو جائے۔ میں سور کے گوشت کے معاملہ میں اہل یورپ اور اہل چین کے نومسلموں میں ذرا ڈھیل دینا پسند کرتا ہوں قرآن سے بھی

مجھے اسکے قطعی حرام ہونے میں شک ہے۔ زیادہ برین نیست کہ اہل عرب کے لیے کسی خاص وجہ سے حرام کردیا گیا ہو۔ مگر ایسے ممالک میں جہاں اس کے بغیر فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ ہو جائے تو کیا ہرج ہے ؟

بہرحال قرآن کا یہی ایک حکم ہے جس کی ممانعت عمومی کی علت میری سمجھ میں اب تک نہیں آئی۔

ورنہ اصولاً معدہ او محرکات اخلاق میں اس قدر بُعد ہے کہ مذہب ہمارے کھانے کا مینو MENU بھی تیار کرے تو کچھ کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہم کو آہن گری، اور زرگری خیاطی وغیرہ کا کام بھی کیوں نہ سکھلائے۔ میرا خیال ہے کہ دنیا میں اسلام کے ترقی نہ کرنے کا راز اسی میں پنہاں ہے کہ وہ آدمی کے تمام حقوق انسانی سلب کرکے اس کو ایک لاشۂ بے جان اور ایسا بچہ بنا دیتا ہے کہ وہ اپنی دنیاوی ترقی کی راہیں سب بھول جاتا ہے۔ ورنہ مذہب حقیقت اسی قدر ہونا چاہیئے جیسا عیسائیوں نے سمجھ رکھا ہے"

اس کے بعد وہ شنگھائی کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"خدا کی اس بے شمار خلقت کو خوش وخرم و خوشحال دیکھ کر دل گوارا نہیں کرتا کہ یہ تمام کے تمام چند سال کے بعد دوزخ کے ایندھن بنائے جائینگے گویا ان کی پیدائش کا یہی ایک مقصد خدا کے پاس رہ گیا ہے۔ پھر یہ سب کے سب الا ماشاء اللہ چند نفوس کے علاوہ اگر بت پرست اور کافر ہیں تو انھوں نے دوزخ میں رکھے جانے کے لیے کیا یہی قصور کیا ہے کہ انہوں نے خدا کی زمین کو معمور کردیا ہے ؟ نہ وہ حاجیوں کو قتل وغارت کرتے ہیں، نہ ان میں قوم لوط کا عمل ہے، نہ وہ کسی کے مال کو ہضم کرلیتے ہیں اور نہ اس کو جائز کرنے کے لیے تاویلیں کرتے ہیں۔ خاموشی سے اس زندگی کو بہت خوبی سے طے کر رہے ہیں، پھر بھی وہ مستحق دوزخ ہیں۔ آخر کیوں ؟ ....

یقیناً مشرکانہ عقیدہ ایک سودائے خام ہے۔ لیکن یہ تو بتادو کہ اگر ایک شخص ایک ایسی ہستی کا فطرتاً قائل ہوجاتا ہے جو اس کو مارتا اور جلاتا ہے تو محض اس لیے کہ اسکی ماہیت اسکی سمجھ سے اتنی ہی باہر ہے جتنی ہماری سمجھ سے، یا وہ عربی کو خدا کی زبان نہیں سمجھتا، تم اس کے دشمن ہو اور وہ تمہارا دشمن ہوجاتا ہے۔ مگر نہیں! تمہارے نزدیک یہ سب کچھ ضروری نہیں ہے۔ ضروری تو یہ ہے کہ پائجامہ ایک خاص وضع کا ہو۔ کرتے کی کاٹ ایسی ہو۔ فلاں قسم کا کھانا کھائے۔ منہ پر چار انگل کی ڈاڑھی ہو، کبھی اپنے ملکی مدرسوں میں قدم نہ رکھے اس واسطے کہ وہاں مذہب کی زبان اور مذہب کا فن تم کو نہیں سکھایا جاتا۔"

جاپان کے بندرگاہ کوبے کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"دو گھنٹہ تک میں کوبے میں پھرتا رہا۔ ایک بھیک مانگنے والا مجھ کو نہ ملا اور کوئی پھٹے پرانے کپڑوں میں بدحال ملا۔ یہ ہے اس قوم کی ترقی کا حال جو نہ مذہب کو جانتی ہے اور نہ خدا کو۔"

پھر وہ بقول خود "موعظہ حسنہ" شروع کرتے ہیں:۔

"یاد رکھو کہ احسان اصل دین ہے اور احسان کسی زبان اور فن کا محتاج نہیں۔ اس کا فطری مقصد یہ ہے کہ ہم آئندہ زندگی، یا خود اس زندگی میں اپنے اعمال کے جواب دہ ہیں اور ہونگے یہی دراصل مذہب اسلام ہے۔ اس سے زیادہ جس چیز کا تم نے مذہب نام رکھا ہے وہ محض تمہارے نفس کا ڈھکوسلا یا تمہارے دماغ کا خلل ہے۔ جس روز ان دونوں باتوں پر مذہب کو محدود کرو گے اور اپنی ساری بیڑیاں شریعت کی توڑ ڈالوگے، تم بھی قوموں کے ساتھ بام ترقی پر پہنچو گے، بلکہ یوں کہو کہ تم قوموں میں ضمیر پیدا کروگے جن کے ہاتھ سے اگر دنیا نہیں گئی ہے تو آسمانی بادشاہت بھی نہ جائے گی۔ تم خود کوئی قوم نہیں ہو بلکہ قوموں کے مصلح ہو۔ مگر خدارا اس کا موقع تو نہ دو کہ

کوئی کہے کہ فلاں قوم برسر اوج ہے مگر جو اُن میں مسلمان ہیں ان کی حالت زبوں ہے، اور یقیناً
اس زبونی کا ذمہ داران کا عجیب و غریب مذہب ہے"۔

یہ تحریر ہماری نئی تعلیم یافتہ نسل کی عام دماغی حالت کا ایک واضح نمونہ ہے۔ مسلمان کے گھر پیدا ہونے، مسلم سوسائٹی کے رکن کی حیثیت سے پلے بڑھے، مسلمانوں کے ساتھ معاشرت و تمدن کی بندشوں میں بندھے، اس لیے اسلام کی محبت، مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی، اور مسلمان رہنے کی خواہش گویا ان کی گھٹی میں پڑی اور ان کے دلوں میں اس طور پر بیٹھ گئی کہ اس میں ان کے ارادے، اور ان کی اپنی عقلی و فکری قوتوں کا دخل نہ تھا۔ مگر قبل اس کے کہ اس اضطراری اور غیر شعوری اسلام کو تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے اختیاری اور شعوری اسلام بنایا جاتا، اور ان میں یہ صلاحیت پیدا کی جاتی کہ وہ اسلامی تعلیمات کو پوری طرح سمجھ کر مسلمان ہوتے اور عملی زندگی میں اس کے احکام و قوانین کو برت کر بھی دیکھ لیتے، انہیں انگریزی مدرسوں اور کالجوں میں بھیج دیا گیا جہاں ان کے قوائے ذہنی و فکری کی پرورش بالکل غیر اسلامی تعلیم و تربیت میں ہوئی اور ان کے دماغوں پر مغربی افکار اور مغربی تہذیب کے اصول اس طرح چھا گئے کہ ہر چیز کو وہ مغرب کی نظر سے دیکھنے اور ہر مسئلہ پر مغرب ہی کے ذہن سے غور کرنے لگے، اور مغربیت کے اس استیلاء سے آزاد ہو کر سوچنا اور دیکھنا ان کے لیے ناممکن ہو گیا۔ مغرب سے انھوں نے عقلیت RATIONALISM کا سبق ضرور سیکھا، مگر خود عقل ان کی اپنی نہ تھی بلکہ یورپ سے حاصل کی ہوئی تھی، اس لیے ان کی عقلیت درحقیقت فرنگی عقلیت ہو گئی نہ کہ آزادانہ عقلیت۔ انھوں نے مغرب سے تنقید CRITICISM کا بھی درس لیا، مگر یہ آزاد تنقید کا درس نہ تھا، بلکہ اس بات کا درس تھا کہ مغرب کے اصولوں کو برحق مان کر ان کے معیار پر ہر اس چیز کو جانچو جو مغربی نہیں ہے، لیکن خود مغرب کے اصولوں کو تنقید سے بالاتر سمجھو۔ اس تعلیم و تربیت کے بعد جب یہ لوگ کالجوں سے بالغ ہو کر نکلے، اور زندگی کے میدان عمل میں انھوں نے قدم رکھا تو ان کے دل اور دماغ میں بُعد المشرقین واقع ہو چکا تھا۔ دل مسلمان تھے اور دماغ غیر مسلم۔ رہتے مسلمانوں میں تھے، شب و روز کے معاملات مسلمانوں کے ساتھ تھے، تمدن و معاشرت کی بندشوں میں مسلمانوں کے ساتھ بندھے ہوئے تھے،

اپنے گرد و پیش مسلمانوں کی مذہبی و تمدنی زندگی کے اعمال دیکھ رہے تھے، ہمدردی و محبت کے رشتے مسلمانوں سے وابستہ تھے، مگر سوچنے اور سمجھنے اور رائے قائم کرنے کی جتنی قوتیں تھیں وہ سب مغربی سانچوں میں ڈھلی ہوئی تھیں، جن سے نہ اسلام کا کوئی قاعدہ مطابقت رکھتا تھا اور نہ مسلمانوں کا کوئی عمل۔ انہوں نے مغربی معیار کے مطابق اسلام اور مسلمانوں کی ہر چیز پر تنقید شروع کی اور ہر اس چیز کو غلط اور قابلِ ترمیم سمجھا جسے اس معیار کے خلاف پایا، خواہ وہ اسلام کے اصول میں سے ہو یا فروع میں سے، یا محض مسلمانوں کا عمل ہو۔ ان میں سے بعض نے تحقیقِ حال کے لیے کچھ اسلام کا مطالعہ بھی کیا مگر تنقید و تحقیق کا معیار وہی مغربی تھا۔ ان کی ذہنیت کے ٹیڑھے سوراخ میں اسلام کی سیدھی میخ آخر بیٹھتی تو کیونکر؟

مذہبی مسائل پر جب یہ حضرات اظہارِ خیال کرتے ہیں تو ان کی باتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بغیر سوچے سمجھے تقریر فرما رہے ہیں۔ نہ ان کے مقدمات درست ہوتے ہیں، نہ منطقی اسلوب پر ان کو ترتیب دیتے ہیں، اور نہ صحیح نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ کلام کرتے وقت خود اپنی پوزیشن بھی متعین نہیں کرتے۔ ایک ہی سلسلۂ کلام میں مختلف حیثیتیں اختیار کر جاتے ہیں، ابھی ایک حیثیت سے بول رہے تھے کہ دفعتہً ایک دوسری حیثیت اختیار کر لی اور اپنی پچھلی حیثیت کے خلاف بولنے لگے۔ یہ سستی فکر ان کے مذہبی افشانات کی نمایاں خصوصیت ہے۔ مذہب کے علاوہ جس مسئلے پر بولیں گے ہوشیار اور چوکنے ہو کر بولیں گے۔ کیونکہ وہاں اگر کسی قسم کی بے ضابطگی ہو گئی تو جانتے ہیں کہ اہلِ علم کی نگاہ میں کوئی وقعت باقی نہ رہے گی۔ لیکن مذہب چونکہ ان کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا، اور اس کو وہ اتنا وزن ہی نہیں دیتے کہ اس پر کلام کرتے وقت اپنے دماغ پر کچھ زور دینا ضروری سمجھیں، اس لیے یہاں وہ بالکل بے فکری کے ساتھ ڈھیلی ڈھالی گفتگو فرماتے ہیں، گویا کھانا کھا کر آرام کرسی پر دراز ہیں اور محض تفریح کے طور پر بول رہے ہیں جس میں ضوابطِ کلام کو ملحوظ رکھنے کی کوئی حاجت ہی نہیں۔

دوسری بات جو ان کی تحریروں میں نمایاں نظر آتی ہے وہ خیالات کی سطحیت اور معلومات کی کمی ہے۔ مذہب کے سوا کسی اور مسئلے میں وہ اتنی کم معلومات اور اس قدر کم غور و فکر کے ساتھ بولنے کی جرأت نہیں کر سکتے کیونکہ وہاں اگر تحقیق کے

بغیر ایک کلمہ منہ سے نکل جائے تو آبرو جاتی رہے۔ لیکن مذہب کے معاملہ میں وہ تحقیق اور مطالعہ اور غور و فکر کو ضروری نہیں سمجھتے۔ سرسری طور پر جو کچھ معلوم ہوگیا اسپر رائے قائم کرلی اور بے تکلف اس کو بیان کردیا۔ اس لیے کہ کسی گرفت کا یہاں خوف ہی نہیں۔ گرفت اگر کرے گا تو مولوی کرے گا۔ اور مولوی کے متعلق یہ بات پہلے ہی اصول موضوعہ کے طور پر داخل مسلمات ہوچکی ہے کہ وہ تاریک خیال، دنیا نویس، اور تنگ نظر ہوتا ہے۔

فاضل محترم جناب سید مقبول احمد صاحب کی تحریر ان دونوں خصوصیات کی حامل ہے۔ سب سے پہلے تو ان کے مضمون سے یہی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ مسلم کی حیثیت سے کلام کر رہے ہیں یا غیر مسلم کی حیثیت سے ہے۔ اسلام کے متعلق گفتگو کرنے والے کی دو ہی حیثیتیں ہوسکتی ہیں۔ یا وہ مسلم ہوگا یا غیر مسلم۔ جو شخص مسلم کی حیثیت سے کلام کرے گا عام اس سے کہ وہ خوش عقیدہ ORTHODOX ہو، یا آزاد خیال یا اصلاح طلب، بہر حال اس کے لیے لازم ہوگا کہ دائرۂ اسلام کے اندر رہکر کلام کرے یعنی قرآن کو منتہائے کلام۔ FINAL AUTHORITY سمجھے اور ان اصول دین و قوانین شریعت کو تسلیم کرے جو قرآن نے مقرر کئے ہیں، کیونکہ اگر وہ قرآن کی سند کو نہ مانے گا اور کسی ایسی بات میں کلام کی گنجائش سمجھے گا جو قرآن سے ثابت ہو، تو دائرہ اسلام سے باہر نکل آئے گا، اور اس دائرے سے نکلنے کے بعد اسکی مسلمانہ حیثیت باقی ہی نہ رہے گی کہ وہ اس میں کلام کرسکے۔ رہی دوسری حیثیت یعنی یہ کہ بولنے والا غیر مسلم ہو، تو اس حیثیت میں اسے پورا حق ہوگا کہ قرآن کے اصول اور اس کے احکام پر جیسی چاہے تنقید کرے، اسلیے کہ وہ اس کتاب کو منتہائے کلام نہیں مانتا۔ لیکن یہ حیثیت اختیار کرنے کے بعد اسے مسلم کی حیثیت سے گفتگو کرنے اور مسلمان بن کر مسلمانوں کو اسلام کے معنی سمجھانے اور اسلام کی ترقی کے وسائل بتانے کا کوئی حق نہ ہوگا۔ ایک صاحب عقل و شعور آدمی جب سوچ سمجھ کر اسلام کے متعلق گفتگو کرے گا تو وہ سب سے پہلے یہ فیصلہ کرے گا کہ وہ ان دونوں حیثیتوں میں سے کونسی حیثیت اختیار کرسکتا ہے، پھر وہ جو حیثیت بھی اختیار کرے گا اس کے عقلی شرائط کو ملحوظ رکھے گا۔ کیونکہ بیک وقت اپنے آپ کو مسلمان بھی کہنا اور قرآن کے مقرر کئے ہوئے اصول و قوانین پر نکتہ چینی کا حق بھی استعمال کرنا، قرآن کی سند میں کلام بھی کرنا اور مسلمانوں کو

مزعومہ حسنہ بھی سمانا کسی عاقل کا فعل نہیں ہوسکتا۔ نقیضین کو جمع کرنا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک ہی شخص بیک وقت مسلم بھی ہو اور غیر مسلم بھی۔ دائرہ اسلام میں داخل بھی ہو اور اس سے خارج بھی۔

اگر سید صاحب اسلام کے سوا کسی دوسرے مسئلے پر کلام فرماتے تو ہم ان کے متعلق یہ بدگمانی نہیں کر سکتے کہ وہ اس طرح دو مختلف حیثیتیں بیک وقت اپنے اندر جمع کر لیتے۔ ہم ان سے یہ توقع نہیں رکھتے کہ وہ قیصر ہند کی عدالت میں بیٹھ کر قیصر ہند کے اعتماد رکھتے ہوئے قوانین پر نکتہ چینی کرنے کا حق استعمال فرمائیں گے۔ نہ ہم ان سے اس جرأت کی امید رکھتے ہیں کہ وہ کسی مذہب فکری SCHOOL OF THOUGHT کی پیروی کا دعویٰ کرنے کے بعد ان اصولوں پر مخالفانہ نکتہ چینی کریں گے جن پر وہ مذہب قائم ہے۔ لیکن یہ طرفہ ماجرا ہے کہ اسلام کے معاملہ میں موصوف نے دو بالکل متخالف حیثیتیں اختیار کی ہیں، اور یہ محسوس تک نہیں کیا کہ وہ بار بار اپنی پوزیشن بدل رہے ہیں۔ ایک طرف وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، مسلمانوں کا سا نام رکھتے ہیں، مسلمانوں کی زبوں حالی پر اظہار رنج فرماتے ہیں، اسلام کی ترقی کی خواہش ظاہر کرتے ہیں، مسلمانوں کو ”احسان“ یعنی ”اصل دین“ کا وعظ سناتے ہیں۔ دوسری طرف اس کتاب کے مقرر کئے ہوئے اصول اور قوانین پر نکتہ چینی بھی کرتے ہیں جس پر اسلام کی بنیاد قائم ہے اور جس کو آخری سند تسلیم کرنا مسلمان ہونے کی لازمی شرط ہے۔ قرآن ایک جگہ نہیں چار جگہ بالتصریح تمام مسلمانوں کے لیے سور کے گوشت کو حرام قرار دیتا ہے مگر آپ اس معاملہ میں ڈھیل دینا پسند فرماتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ ”ترقی اسلام“ کے لیے (خدا جانے قرآن سے باہر وہ کون سا اسلام ہے جس کی ترقی آپ چاہتے ہیں؟) قرآن فی الواقع انسان کے لیے کھانے کا مینو طیار کرتا ہے، کھانے کی چیزوں میں حرام و حلال، خبیث و طیب کا فرق قائم کرتا ہے اور صاف کہتا ہے کہ تم اپنے اختیار سے کسی شے کو حلال اور کسی کو حرام قرار دینے کا حق نہیں رکھتے۔ مگر آپ کو اپنے اس حق پر اصرار ہے اور خود قرآن کا یہ حق تسلیم کرنے میں تامل ہے کہ وہ کھانے پینے میں مذہب کو دخل دے۔ قرآن مذہب کو ان حدود میں محدود نہیں رکھتا جن میں سینٹ پال (نہ کہ مسیح ؑ) کے متبعین نے اسکو محدود کیا ہے اور

لباس، اکل وشرب، نکاح وطلاق، وراثت، لین دین، سیاست، عدالت، تعزیرات وغیرہ کے قوانین وضع کرتا ہے، مگر آپ اس پر سختی کے ساتھ اعتراض کرتے ہیں، اس کو "ترقی اسلام" میں مانع قرار دیتے ہیں، اس کو الزام دیتے ہیں کہ وہ انسان کو ایک لاشۂ بے جان اور بے بس بچہ بنا دیتا ہے، اور تجویز کرتے ہیں کہ مذہب بس اسی قدر ہونا چاہیئے جس قدر عیسائیوں (درحقیقت پولوسیوں) نے سمجھا ہے۔ قرآن نے خود قوانین شریعت بنائے ہیں اور ان کو حدود اللہ سے تعبیر کر کے ان کی پابندی کا حکم دیا ہے۔ مگر آپ شریعت کی ان حدوں کو "بیڑیوں" سے تعبیر کرتے ہیں، اور سینٹ پال کی طرح مذہب کی توسیع و ترقی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ ان بیڑیوں کو توڑ ڈالا جائے۔ قرآن کے نزدیک ایمان نجات کی پہلی اور لازمی شرط ہے، اور جو لوگ خدا پر ایمان نہیں رکھتے ان کے متعلق وہ بالفاظ صریح کہتا ہے کہ وہ دوزخ کا ایندھن بنائے جائیں گے خواہ وہ بے شمار ہوں یا شمار میں آجائیں، خوش حال ہوں یا بدحال۔ مگر آپ کا حال یہ ہے کہ کافروں اور بت پرستوں کی بے شمار خلقت کو خوش و خرم و خوشحال دیکھ کر آپ کا دل گواہی نہیں دیتا کہ چند سال کے بعد وہ سب دوزخ کا ایندھن بنا دیے جائیں گے اور آپ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ انھوں نے خدا کی زمین کو معمور کر دینے کے سوا اور کون سا قصور کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن سے اتنا کھلا ہوا اختلاف رکھتے ہوئے آپ مسلمان کیسے رہ سکتے ہیں، اور مسلمان ہوتے ہوئے قرآن سے اختلاف کیونکر کر سکتے ہیں؟ اگر آپ مسلمان ہیں تو قرآن سے اختلاف نہ فرمائیے اور اگر قرآن سے اختلاف کرنا چاہتے ہیں تو دائرۂ اسلام سے باہر کھڑے ہو کر اختلاف کیجیے۔

جو شخص کسی مذہب کے اصول اور احکام و قوانین سے مطمئن نہ ہو، جس کا دل ان کی صداقت پر گواہی نہ دیتا ہو، جو ان کی علت و مصلحت کو سمجھنے سے عاجز ہو، اور جس کے نزدیک ان میں سے بعض یا اکثر باتیں قابل اعتراض ہوں، اس کے لیے دو راستے کھلے ہوئے ہیں۔ یا تو وہ اس مذہب سے نکل جائے۔ پھر اس کو حق ہے کہ اس مذہب کے جس قاعدے اور جس حکم پر چاہے نکتہ چینی کرے۔ یا اگر وہ اس عدم اطمینان کے باوجود اس مذہب میں رہنا چاہتا ہے تو اس کے خلاف مناظرہ کرنے سے احتراز کرے، اور مجتہدین کو اس کے قواعد و ضوابط پر تیشہ چلانے کے بجائے طالب علم بن کر

اپنے شکوک و شبہات حل کرنے کی کوشش کرے۔ عقل و دانش کی رو سے تو اس حالت میں یہی دو طریقے معقول ہو سکتے ہیں، اور مرد عاقل جب کبھی ایسی حالت میں مبتلا ہوگا تو انہی میں سے کسی ایک طریقے کو اختیار کرے گا۔ لیکن مقبول صاحب اور ان کی طرح بہت سے فرنگی تعلیم و تربیت پائے ہوئے حضرات کا حال یہ ہے کہ پہلا طریقہ اختیار کرنے کی اخلاقی جرأت ان میں نہیں۔ اور دوسرا طریقہ اختیار کرتے ہوئے انہیں شرم آتی ہے۔ اس لیے انھوں نے بیچ کا ایک غیر معقول طریقہ اختیار کیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک طرف مسلمانوں میں شامل بھی ہوتے ہیں، ترقی اسلام کے آرزومند بھی بنتے ہیں، اسلام اور مسلمانوں کے درد میں تڑپتے بھی ہیں، اور دوسری طرف اسلام کے خلاف وہ سب کچھ کہتے اور کرتے ہیں جو ایک غیر مسلم کہہ اور کر سکتا ہے، حدیث و فقہ تو درکنار قرآن تک پر نکتہ چینی کرنے سے باز نہیں رہتے، اور ان تمام بنیادوں پر ضرب لگا جاتے ہیں جن پر اسلام قائم ہے۔ ان حضرات کو دعویٰ ہے کہ ہم ارباب عقل (RATIONAL-ISTS) ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم کوئی ایسی بات نہیں مان سکتے جو عقل کے خلاف ہو۔ ملاؤں پر ان کا سب سے بڑا الزام یہی ہے کہ وہ عقل سے کام نہیں لیتے۔ مگر خود ان کا حال یہ ہے کہ مذہب کے معاملہ میں صریح تناقض باتیں کرتے ہیں۔ متضاد طرز عمل اختیار کرتے ہیں، اور اپنی ایک بات کی تردید خود اپنی ہی دوسری بات سے کر جاتے ہیں۔ آخر یہ ریشنلزم کی کون سی قسم ہے جس کی ایجاد کا شرف ان روشن خیال محققین کو حاصل ہوا ہے؟

اب ذرا ان کی معلومات کی وسعت اور فکر کی گہرائی ملاحظہ فرمائیے:۔

اسلام کی ترقی کے لیے آپ ضروری سمجھتے ہیں کہ مسیحیت کی طرح اسلام سے بھی شرعی حدود ہٹا دی جائیں، اور اسلام صرف ایک عقیدہ کی حیثیت میں رہ جائے۔ کیونکہ مسیحیت کی ترقی کا راز جو آپ نے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں حرام و حلال کی قیود نہیں ہیں، اخلاقی پابندیاں نہیں ہیں، اس میں آدمی کے "حقوق انسانی سلب کرکے اس کو ایک لاشۂ بے جان اور بے بس بچہ" نہیں بنایا گیا ہے، بلکہ اس کو آزادی دی گئی ہے کہ مسیح پر ایمان رکھ کر جو چاہے کرے۔ مگر آپ نے یہ غور نہیں فرمایا کہ اسلام جس چیز کا نام ہے وہ قرآن میں ہے، اور قرآن نے

ایمان و عمل صالح کے مجموعہ کا نام اسلام رکھا ہے، عمل صالح کے لیے قیود مقرر کی ہیں، قوانین بنائے ہیں، اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے ایک مکمل نظام عمل مقرر کیا ہے جس کے بغیر اسلام بحیثیت ایک دین اور ایک تہذیب کے قائم نہیں ہو سکتا۔ اس نظام اور اسکی حدود کو منسوخ کرنے کا اختیار کسی مسلمان کو نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا نسخ قرآن کا نسخ ہے، اور قرآن کا نسخ اسلام کا نسخ ہے، اور جب اسلام خود ہی منسوخ ہو جائے تو اسکی "ترقی" کے کیا معنی؟ آپ خود کسی مذہب کو ایجاد کر کے اسکی اشاعت فرما سکتے ہیں، مگر جو چیز قرآن کے خلاف ہے اسکو اسلام کے نام سے موسوم کرنے، اور اس کی ترویج کو اسلام کی ترقی کہنے کا آپ کو کیا حق ہے؟

آپ اسلام صرف اس عقیدہ کا نام رکھتے ہیں کہ "ہم آیندہ زندگی میں یا خود اس زندگی میں اپنے اعمال کے جوابدہ ہیں اور ہونگے"۔ یہ بات غالباً آپنے اس امید پر فرمائی ہے کہ اگر اسلام اس حد میں محدود ہو جائے گا تو بالکل نرم اور آسان ہو جائے گا۔ اور خوب پھیلتا چلا جائے گا۔ لیکن اگر آپ اس عقیدہ کے معنی پر غور فرماتے تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ اس حد میں محدود ہونے کے بعد بھی اسلام آپ کی مرضی کے مطابق نہیں ہو سکتا۔ اس عقیدے کو مذہب قرار دینے کے لیے سب سے پہلے تو حیات اخروی پر ایمان لانا ضروری ہے۔ پھر جوابدہی کا مفہوم تین باتوں کا متقاضی ہے ایک یہ کہ جس کے سامنے جوابدہی کرنی ہے اسکو متعین کیا جائے، اور اسکی بالادستی کو تسلیم کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ جوابدہی کی نوعیت متعین کی جائے اور زندگی کے اعمال میں اس لحاظ سے امتیاز کیا جائے کہ کن اعمال سے اس جوابدہی میں کامیابی نصیب ہوگی اور کون سے اعمال ناکامی کے موجب ہونگے۔ تیسرے یہ کہ جوابدہی میں کامیابی اور ناکامی کے جدا جدا نتائج متعین کئے جائیں، کیونکہ اگر ناکامی کا نتیجہ بھی وہی ہو جو کامیابی کا ہے، یا سرے سے دونوں کا کوئی نتیجہ ہی نہ ہو تو جوابدہی بالکل بے معنی ہے۔ یہ اُس عقیدہ کے عقلی لوازم ہیں جس کو آپ اصل دین قرار دے رہے ہیں۔ اگر آپ کی تجویز کے مطابق اسی عقیدہ پر اسلام کو قائم کر دیا جائے، تب بھی وہی مصیبت پیش آئے گی جس سے آپ بچنا چاہتے تھے۔ پھر تو ہی خدا کو ماننا لازم آئے گا جس کے بغیر جا بان آپ کو ترقی کے بام پر چڑھتا ہوا نظر آیا تھا۔

پھر وہی شریعت کی بیڑیاں اور اخلاق کی حدیں بن جائیں گی جن کو آپ توڑنا چاہتے ہیں اور جن کے وجود میں آپ کے نزدیک اسلام کے ترقی نہ کرنے کا راز پوشیدہ ہے۔ پھر وہی عذاب و ثواب کا جھگڑا نکل آئے گا اور خدا کی بے شمار خلقت کو اس عقیدے کے بغیر خوش و خرم و خوش حال دیکھ کر آپ کا دل پھر اس بات پر گواہی دینے سے انکار کرے گا کہ چند سال بعد یہ سب عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

براہ کرم اب ذرا غور کر کے کسی ایسی چیز کا نام اسلام رکھیے جس میں کسی قسم کی قید و بند نہ ہو، جس کو ماننے اور نہ ماننے کا نتیجہ یکساں ہو، جس میں صرف خدا کی زمین کو معمور کر دینا دنیا و آخرت کی کامیابی کے لیے کافی ہو، اور جس پر ایمان نہ لانے والی بے شمار خلقت کو خوش و خرم و خوش حال دیکھ کر آپ کا دل گواہی دے سکے کہ وہ سب جنت کی بلبلیں بن جائیں گی۔"

قرآن کی رو سے سور کے گوشت کا قطعی حرام ہونا آپ کے نزدیک مسلم نہیں ہے۔ آپ شک فرماتے ہیں کہ شاید یہ اہل عرب کے لیے کسی خاص وجہ سے حرام کر دیا گیا ہو۔ لیکن اگر آپ اس رائے کو ظاہر کرنے سے پہلے قرآن کھول کر پڑھ لیتے تو اس شک کی تحقیق ہو جاتی۔ اس کتاب میں صاف لکھا ہوا ہے کہ:-

قُلْ لَّا اَجِدُ فِيْ مَا اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى
طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗ اِلَّا اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا
مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ
اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ
بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (۱۴۶)

اے پیغمبر! کہو کہ میری طرف جو وحی بھیجی گئی ہے اس میں کسی چیز (کوئی) کو کہ جسے کھانے والا کھائے، میں حرام نہیں پاتا، الا یہ کہ وہ مردار ہو یا بہا ہوا خون ہو یا سور کا گوشت ہو، کیونکہ وہ بتحقیق ناپاک ہے، یا نافرمانی کے طور پر اللہ کے سوا کسی اور کے نام سے ذبح کیا گیا ہو۔ پھر جو شخص مجبور ہو گیا بغیر اس کے کہ وہ نافرمان اور حد ضرورت سے تجاوز کرنے والا ہو، تو تیرا رب بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اس آیت میں سور کے گوشت کو ہر "طاعم" یعنی کھانے والے کے لیے حرام قرار دیا گیا ہے، اور حرمت

کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ "رجس" (ناپاک) ہے۔ کیا یہاں طاعم سے مراد عرب کا طاعم ہے؟ اور کیا ایک ہی چیز عرب کے لیے رجس اور غیر عرب کے لیے طیب و طاہر ہوسکتی ہے؟ اور کیا اسی طریقہ سے آپ مردار کھانے والوں کے لیے بھی ذرا ڈھیل دینا پسند فرمائیں گے؟ آپ سور کے معاملہ میں ڈھیل دینا چاہتے ہیں تو اپنے اختیار سے دیجئے۔ مگر قرآن کے صریح الفاظ کے خلاف آپ کو یہ کہنے کا کیا حق ہے کہ قرآن سے اس کی قطعی ممانعت مشکوک ہے؟

آج کل کے نئے مجتہدین نے اجتہاد کے جو اصول وضع کیے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسلام کے جس حکم کی خلاف ورزی کرنا چاہتے ہیں اس کے متعلق بلا تکلف کہہ دیتے ہیں کہ یہ حکم خاص اہل عرب کے لیے تھا، خواہ قرآن میں اس تخصیص کی طرف کوئی ادنیٰ سا اشارہ بھی نہ ہو، اور تخصیص کے لیے وہ کوئی عقلی یا نقلی دلیل نہ رکھتے ہوں۔ اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو بعید نہیں کہ ایک روز قرآن ہی کو اہل عرب کے لیے مخصوص نہ کردیا جائے۔

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ سے استدلال اتنا لطیف ہے کہ صاحب سفرنامہ کے علم و فضل کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ غالباً اس آیت کا ترجمہ انھوں نے یہ کیا ہوگا کہ "جب سور کا گوشت کھانے کو بے اختیار جی چاہے تو کھالو مگر باغ میں صبح تڑکے نہ کھانا اور نہ اس کی عادت ڈال لینا"۔

سور کے گوشت کے معاملہ میں اہل یورپ اور اہل چین کے لیے ڈھیل دینے کی گنجائش اس آیت سے وہی شخص نکال سکتا ہے جو نہ اضطرار کے معنی جانتا ہو، نہ باغی کا مفہوم سمجھتا ہو اور نہ عادی کا۔ ورنہ جاننے والے کے لیے تو اتنی جرأت کرنا بہت مشکل ہے۔ آیت کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ جن لوگوں کو مردار خوری یا خون آشامی کا چسکا لگا ہوا ہو یا جو لوگ سور کے گوشت پر جان دیتے ہوں، یا جن کے ہاں ما اھل بہ لغیر اللہ کے کھانے کا عام دستور ہو وہ سب مضطرین میں داخل ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو تحریم کا حکم ہی بے معنی ہوجاتا کیونکہ اگر تحریم ان لوگوں کے لیے تھی جو ان چیزوں کے خوگر تھے، تو استثناء سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنی عادت کے مطابق انھیں کھاتے رہتے، اور اگر تحریم ان لوگوں کے لیے تھی جو خود ہی ان سے مجتنب تھے تو ان کے لیے اس حکم کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اضطرار کے ساتھ غیر باغ ولا عاد کی شرط لگا کر جو استثنا کیا گیا ہے اس

مفہوم تو یہ ہے کہ جو شخص بھوک سے مر رہا ہو، اور حرام چیز کے سوا کوئی چیز اس کو نہ ملتی ہو، وہ محض جان بچانے کے لیے حرام چیز کھا سکتا ہے، بشرطیکہ حد رخصت سے تجاوز نہ کرے، یعنی جان بچانے کے لیے جتنی مقدار ناگزیر ہو اس سے زیادہ نہ کھائے، اور حدود اللہ کو توڑنے کی اس میں خواہش نہ ہو۔ اس بات کو ایک دوسری جگہ سود اور مردار وغیرہ چیزوں کی تحریم کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح بیان کیا گیا ہے فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّإِثْمٍ یعنی جو شخص بھوک کی شدت سے مجبور ہو جائے بغیر اس کے کہ گناہ کی طرف کوئی میلان ہو، وہ اس حالت میں حرام چیز کھا سکتا ہے۔ کہاں یہ بات اور کہاں وہ کہ اہل یورپ اور اہل چین چونکہ سور کے گوشت پر جان دیتے ہیں لہٰذا فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ سے فائدہ اٹھا کر ان کے لیے سور کو جائز کر دیا جائے، اور وہ بھی اس لیے کہ وہ اسلام میں داخل ہو سکیں۔ اگر اسی طریقہ سے ہر قوم کی رغبتوں اور خواہشوں کا لحاظ کر کے اسلام کے قوانین میں ڈھیل دینے کا سلسلہ شروع ہوا تو شراب، جوا، زنا، سود اور ایسی ہی دوسری چیزوں کو بھی ایک ایک کر کے حلال کرنا پڑے گا۔ سوال یہ ہے کہ جو لوگ خدا کے احکام کو ماننے اور اس کے قائم کئے ہوئے حدود کی پابندی کرنے اور اس کے حرام کو حرام سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہیں ان کو اسلام میں داخل کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اسلام ان کا محتاج کب ہے کہ وہ ان کو راضی کرنے کے لیے کم و بیش پر سودا کرے ؟ ۔

پہلے تو صرف سور کے گوشت کی علتِ حرمت آپ کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ مگر پھر جو آپ نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اصولِ معدہ اور محرکات اخلاق میں بونِ بعید ہے، لہٰذا آپ نے یہ رائے قائم فرمائی کہ مذہب کو سرے سے حرام و حلال کا امتیاز ہی قائم کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اس ارشاد سے یہ راز فاش ہو گیا کہ آپ جو کچھ قرآن کے متعلق جانتے ہیں، حکمتِ طبیعی PHYSICAL SCIENCE کے متعلق اس سے کچھ زیادہ نہیں جانتے۔ قرآن سے ناواقف ہونا تو خیر ایک روشن خیال تعلیم یافتہ آدمی کے لیے شرمناک نہیں ہے، مگر سائنس سے اتنی بے خبری البتہ بہت شرمناک ہے۔ آپ کو اب تک یہ بھی نہیں معلوم ہوا کہ انسان کے نفس اور اس کی ترکیب جسمانی کے درمیان

کیا تعلق ہے، اور اس کی ترکیب جسمانی غذا سے کیا تعلق رکھتی ہے۔ مذہبی نظریہ کی رو سے تو خیر نفس اور جسم دو علیحدہ چیزیں ہیں اور ان کے درمیان صرف تعامل ہوتا ہے، لیکن سائنس تو نفس کو سراسر جسم ہی کی مخصوص ترکیب کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اس لحاظ سے جو چیز جسم کو اس کے اجزائے ترکیبی فراہم کرتی ہے اس کا اثر نفس کے خصائص پر مترتب ہونا بالکل ناقابل انکار ہے۔ جس طرح سور کے نفسانی خصائص میں اسکی ترکیب جسمانی کا یقینی دخل ہے، اسی طرح جسم کے واسطے سے انسان کے نفس پر سور کے گوشت کا اثر پڑنا بھی یقینی ہے۔ اگر آپ غذا کے متعلق سائنس کی جدید ترین تحقیقات کا مطالعہ فرماتے تو آپ کو معلوم ہوجاتا کہ اخلاق پر غذا کا اثر اب عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے، اور حکماء اس مسئلہ کی طرف متوجہ ہوگئے ہیں کہ مختلف قسم کی غذاؤں سے ہمارے اخلاق اور ہماری ذہنی قوتوں پر کیا اثرات پڑتے ہیں۔

مقالات

اسلامی تہذیب اور اُس کے اصول و مبادی

(۱۸)

ایمان

ایمانیات پر مجموعی نظر ایمان کے پانچوں شعبوں پر تفصیل کے ساتھ کلام کیا جا چکا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے متعلق اسلام کا تفصیلی عقیدہ، نقد صحیح کے لحاظ سے اس کا عقلی مرتبہ، انسانی سیرت پر اس کے اثرات، اور تہذیب کی تاسیس و تشکیل میں اس کا حصہ آپ معلوم کر چکے ہیں۔ اب ایک مرتبہ مجموعی حیثیت سے ان سب پر نظر ڈال کر دیکھنا چاہیے کہ یہ ایمانیات مل جل کر کس قسم کی تہذیب پیدا کرتے ہیں۔

اس مضمون کے ابتدائی ابواب میں بیان کیا جا چکا ہے کہ اسلامی تہذیب کا سنگ بنیاد، حیات دنیا کا یہ تصور ہے کہ انسان کی حیثیت اس کرۂ خاکی میں تمام موجودات کی سی نہیں ہے، بلکہ وہ خداوند عالم کی طرف سے یہاں خلیفہ بنا کر اتارا گیا ہے۔ اس تصور سے، بطور ایک عقلی نتیجہ کے، انسان کی زندگی کا نصب العین قرار پایا کہ وہ اپنے خالق اور اپنے آقا کی خوشنودی حاصل کرے، اور اس نصب العین کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہو گیا کہ

اولاً، وہ خدا کی صحیح معرفت حاصل کرے؛

ثانیاً، وہ صرف خدا کو آمر اور ناہی، حاکم اور مطاع سمجھے اور اپنے اختیار کو احکام خداوندی کے تابع کر دے؛

ثالثاً، وہ ان طریقوں کو معلوم کرے جن سے خدا کی خوشنودی حاصل ہو سکتی ہے، اور جب وہ طریقے

معلوم ہو جائیں تو انہی کے مطابق زندگی بسر کرے،

رابعًا، وہ خدا کی خوشنودی کے ثمرات اور اسکی ناخوشی کے نتائج سے واقف ہو، تاکہ حیات دنیا کے ناکمل نتائج سے دھوکہ نہ کھائے۔

وہ پانچ عقیدے جن کی تفصیل آپ کو اوپر معلوم ہو چکی ہے، اسی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔

خدا کی ذات وصفات کے متعلق جو کچھ قرآن میں بیان کیا گیا ہے وہ سب اس لیے ہے کہ انسان کو اس ہستی کی صحیح معرفت حاصل ہو جس کی طرف سے وہ خلیفہ بنا کر زمین پر بھیجا گیا ہے اور جس کی خوشنودی حاصل کرنا اس کی زندگی کا نصب العین ہے۔ ملائکہ کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ اس لیے ہے کہ انسان، کائنات کی کارکن طاقتوں میں سے کسی کو کارفرما نہ سمجھ بیٹھے، اور کارفرمائی میں خدا کے سوا کسی کو شریک نہ قرار دے۔ اس علم صحیح کے بعد خدا پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح تمام کائنات اور خود انسان کی زندگی کے غیر اختیاری شعبے پر خدا کی حکومت ہے، اسی طرح انسان اپنی زندگی کے اختیاری شعبے میں بھی خدا کی حکومت تسلیم کرے، ہر معاملہ میں خدا کو واضع قانون اور اپنے آپ کو صرف متبع قانون سمجھے، اور اپنے اختیارات کو ان حدود کے اندر محدود کر دے جو خدا نے مقرر کیے ہیں۔ یہی ایمان اپنے اندر وہ قوت رکھتا ہے جو انسان کو خدا کی فرماں روائی کے آگے بطوع ورغبت سر تسلیم خم کر دینے کے لیے آمادہ کرتی ہے۔ اس سے ہر مومن کے اندر ایک خاص نوعیت کا ضمیر پیدا ہوتا ہے، اور ایک خاص قسم کی سیرت بنتی ہے جو قانون اور حدود کے مجبورانہ نہیں بلکہ رضا کارانہ اتباع کے لیے ضروری ہے۔

رسالت اور کتاب کا عقیدہ تیسری ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ انہی دونوں کے ذریعہ سے انسان کو اُن قوانین اور اُن طریقوں کا تفصیلی علم حاصل ہوتا ہے جن کو خدا نے انسان کے لیے مقرر کیا ہے۔ اور ان حدود کی شناخت میسر ہوتی ہے جن سے خدا نے انسان کے اختیارات کو محدود فرمایا ہے۔ رسول کی تعلیم کو خدا کی تعلیم، اور اس کی پیش کی ہوئی کتاب کو خدا کی کتاب سمجھنا ہی ایمان بالرسالت اور ایمان بالکتاب ہے اور اس ایمان ہی سے انسان میں یہ قابلیت پیدا ہوتی ہے کہ یقین واذعان کے ساتھ اُن قوانین اور طریقوں اور حدود کی

پابندی کرے جو خدا نے اپنے رسول اور اپنی کتاب کے واسطے سے اس کو بتائے ہیں۔

آخری ضرورت کو پورا کرنے کے لیے معاد کا علم ہے۔ اس سے انسان کی نظر اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ وہ ظاہر حیات دنیا کے پیچھے ایک دوسرے عالم کو دیکھنے لگتا ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا کی خوش حالی و بدحالی اور منفعت و مضرت، خدا کی خوشنودی و ناخوشی کا معیار نہیں ہے، اور خدا کی جانب سے اعمال کی جزا و سزا اسی دنیا میں ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ آخری فیصلہ ایک دوسرے عالم میں ہونے والا ہے۔ وہی فیصلہ معتبر ہے، اور اس فیصلے میں کامیابی کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ اس دنیا میں خدا کے قانون کی صحیح پیروی اور اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کی پوری پابندی کی جائے۔ اسی عقیدے پر جزم و یقین کا نام ایمان بالیوم الآخر ہے اور ایمان باللہ کے بعد یہ دوسری زبردست قوت ہے جو انسان کو قوانین اسلامی کے اتباع پر ابھارتی ہے۔ تہذیب اسلامی کے لیے انسان کو ذہنی اعتبار سے مستعد کرنے میں اس اعتقاد کا بڑا حصہ ہے۔

اس بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ اساسی اعتقادات انہی خطوط پر تہذیب کی تاسیس و تشکیل کرتے ہیں جو حیات دنیا کے اس مخصوص تصور اور اس خاص نصب العین نے کھینچ دیے تھے۔ ایسی تہذیب کے لیے عقلاً جس اساسی عقیدہ کی ضرورت ہے وہ انہی پانچ امور پر مشتمل ہو سکتا ہے۔ ان کے سوا کسی دوسرے اعتقاد میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ اس مخصوص طرز کی تہذیب کے لیے اساس بن سکے، کیونکہ کوئی دوسرا عقیدہ اس خاص تصور حیات اور نصب العین کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا۔

تہذیب اسلامی کا خاکہ ایمانیات کی جو تفصیلات اوپر بیان ہوئی ہیں، ان پر نظر ڈالنے سے اُس تہذیب کا پورا خاکہ ہمارے سامنے آجاتا ہے جس کی تاسیس ان کے ذریعہ سے کی گئی ہے۔ اس خاکہ کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں:

(۱) اس تہذیب کا نظام ایک سلطنت کا سا نظام ہے اس میں خدا کی حیثیت عام مذہبی تصور کے لحاظ سے محض ایک "معبود" کی سی نہیں ہے، بلکہ دنیوی تصور کے لحاظ سے وہی حاکم مطلق بھی ہے۔ وہ دراصل اس سلطنت کا شہنشاہ ہے، رسول اس کا نمایندہ ہے، قرآن اس کی کتاب آئین ہے، اور ہر وہ شخص جو اسکی

شہنشاہی کو تسلیم کرکے اس کے نمایندے کی اطاعت اور اسکی کتاب آئین کا اتباع کرنا قبول کرے۔ اس سلطنت کی رعیت ہے۔ مسلمان ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس شہنشاہ نے اپنے نمایندے اور اپنی کتاب آئین کے ذریعہ سے جو قوانین مقرر کر دیے ہیں ان کو بے چون و چرا تسلیم کیا جائے خواہ ان کی علت و مصلحت سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ جو شخص خدا کے اس اختیار مطلق اور اس کے قانون کا شخصی یا اجتماعی رائے سے بالاتر ہونا تسلیم نہیں کرتا، اور اس کے فرمان کو ماننے یا نہ ماننے کا حق اپنے لیے محفوظ رکھتا ہے، اس کے لیے اس سلطنت میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔

(۲) چونکہ اس تہذیب کا اصل مقصد انسان کو آخری کامیابی (یعنی آخرت کے فیصلہ میں خداوند عالم کی خوشنودی سے سرفراز ہونے) کے لیے تیار کرنا ہے، اور اس کامیابی کا حصول اس کے نزدیک موجودہ زندگی میں انسان کے صحیح عمل پر موقوف ہے، اور یہ جاننا کہ آخری نتیجہ کے اعتبار سے کون سا عمل مفید ہے اور کون سا مضر انسان کے بس کا کام نہیں، بلکہ وہی خدا اس کو بہتر جانتا ہے جو آخرت میں فیصلہ کرنے والا ہے، اس لیے یہ تہذیب انسان سے مطالبہ کرتی ہے کہ اپنی زندگی کے تمام معاملات میں خدا کے بتائے ہوئے طریقوں کی پیروی کرے، اور اپنی آزادی عمل کو شریعت الٰہی کی قیود سے مقید کر دے۔ اس طرح یہ تہذیب دین اور دنیا دونوں کی جامع ہے۔ اس کو عام محدود معنوں میں "مذہب" کے لفظ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، بلکہ یہ ایک ایسا وسیع نظام ہے جو انسان کے افکار و خیالات، اس کے شخصی کردار و اخلاق، اس کے انفرادی عمل، اس کے خانگی معاملات، اس کی معاشرت، اس کے تمدن، اس کی سیاست، سب پر حاوی ہے اور ان تمام معاملات میں جو طریقے اور قوانین خدا نے مقرر کیے ہیں ان کے مجموعہ کا نام دین اسلام یا تہذیب اسلامی ہے۔

(۳) یہ تہذیب کوئی قومی یا ملکی یا نسلی تہذیب نہیں ہے، بلکہ صحیح معنوں میں انسانی تہذیب ہے۔ یہ انسان کو بحیثیت انسان کے خطاب کرتی ہے، اور ہر اس شخص کو اپنے دائرے میں لے لیتی ہے جو توحید، رسالت، کتاب اور یوم آخر پر ایمان لائے۔ اس طرح اس تہذیب نے ایک ایسی قومیت بنائی ہے جس میں بلا امتیاز

رنگ و نسل و زبان ہر انسان داخل ہوسکتا ہے، جس کے اندر تمام روئے زمین پر پھیل جانے کی استعداد موجود ہے، اور جو تمام بنی آدم کو ایک نظم ملت میں پیوستہ کر دینے، اور ان سب کو ایک تہذیب کا متبع بنا دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ لیکن یہ عالمگیر انسانی برادری قائم کرنے سے اس کا اصل مقصد اپنے متبعین کی مردم شماری بڑھانا نہیں ہے، بلکہ تمام انسانوں کو اس علم صحیح اور عمل صحیح کے فیض میں شریک کرنا ہے جو ان سب کے خدا نے ان سب کی بھلائی کے لیے عطا فرمایا ہے، اس لیے وہ اس برادری میں شامل ہونے کے لیے ایمان کی قید لگا کر صرف ان لوگوں کو چن لینا چاہتی ہے جو خدا کی حکومت مطلقہ کے آگے سر تسلیم خم کرنے کے لیے آمادہ ہوں، اور ان حدود اور قوانین کی پابندی قبول کریں جو خدا نے اپنے رسول اور اپنی کتاب کے ذریعہ سے مقرر کیے ہیں کیونکہ صرف ایسے ہی لوگ (خواہ وہ کتنے ہی کم ہوں) اس تہذیب کے نظام میں کھپ سکتے ہیں، اور انہی سے ایک صحیح اور منضبط نظام قائم ہوسکتا ہے۔ منکرین یا منافقین یا ضعیف الایمان لوگوں کا گھس آنا اس نظام کے لیے سبب قوت نہیں بلکہ موجب ضعف ہے۔

(۴) ہمہ گیری اور آفاقیت کے ساتھ اس تہذیب کی نمایاں خصوصیت اس کا زبردست ڈسپلن اور اس کی طاقت و گرفت ہے جس سے وہ اپنے متبعین کو شخصی و اجتماعی حیثیت سے اپنے آئین کا پابند بناتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ قوانین بنانے، اور حدود مقرر کرنے سے پہلے قوانین کا اتباع اور حدود کی پابندی کرانے کا بندوبست کرتی ہے۔ حکم دینے سے پہلے اس کا انتظام کرتی ہے کہ اس کا حکم نافذ ہو۔ وہ سب سے پہلے انسان سے خدا کی فرمانروائی تسلیم کراتی ہے، پھر اس کو یقین دلاتی ہے کہ رسول اور کتاب کے ذریعہ سے جو احکام دیے گئے ہیں وہ خدا کے احکام ہیں، اور ان کی اطاعت عین خدا کی اطاعت ہے، پھر وہ اس کے نفس میں ایک ایسی پولیس متعین کر دیتی ہے جو ہر وقت اور ہر حال میں اس کو احکام کی اطاعت پر ابھارتی، خلاف ورزی پر سرزنش کرتی، اور عذاب یوم عظیم کا خوف دلاتی رہتی ہے۔ اس طرح جب وہ اس قوت نافذہ کو ہر شخص کے نفس و ضمیر میں متمکن کر کے اپنے پیرووں میں یہ صلاحیت پیدا کر دیتی ہے کہ خود اپنی دلی رغبت و

سے قوانین کے اتباع اور حدود کی پابندی اور اخلاق حسنہ سے متخلق ہونے کے لیے آمادہ ہوں ، تب وہ ان کے سامنے اپنے قوانین پیش کرتی ہے ، ان کو احکام دیتی ہے ، ان کے لیے حدود مقرر کرتی ہے ، ان کے لیے زندگی بسر کرنے کے طریقے وضع کرتی ہے ، اور اپنے مصالح کے لیے ان سے سخت سے سخت قربانیوں کا مطالبہ کرتی ہے ۔ یہ ایسا طریقہ ہے جس سے زیادہ حکیمانہ طریقہ اور کوئی نہیں ہوسکتا ۔ اس طریقہ سے اسلامی تہذیب کو جو زبردست نفوذ و اثر حاصل ہوا ہے وہ کسی دوسری تہذیب کو نصیب نہیں ہوا ۔

(۵) دنیوی نقطۂ نظر سے اس تہذیب کا اصل مقصد ایک صحیح اجتماعی نظام قائم کرنا اور ایک صالح اور پاکیزہ سوسائٹی کو وجود میں لانا ہے ۔ مگر ایسی سوسائٹی کا وجود میں آنا ممکن نہیں ہے جب تک کہ اس کے ہر ہر فرد کو اخلاق فاضلہ و صفاتِ حسنہ سے متصف نہ کردیا جائے ، اور اس کے لیے ضروری ہے کہ افراد کے نفوس کا تزکیہ کیا جائے تاکہ وہ ردی اور منتشر افکار کی آماجگاہ نہ رہیں ، صحیح اور پاکیزہ خیالات ان میں راسخ ہوجائیں ، اور ایک ایسی مضبوط سیرت ان کے اندر پیدا ہوجائے جس سے اعمال صالحہ کا صدور بالطبع ہونے لگے ۔ اسلام نے اپنی تہذیب میں اس قاعدہ کی پوری پوری رعایت ملحوظ رکھی ہے ۔ وہ سوسائٹی کے لیے بہترین افراد مہیا کرنا چاہتا ہے ، اور ایسے افراد کی تربیت کے لیے ضروری سمجھتا ہے کہ سب سے پہلے ان میں ایمان کو راسخ کردے ، جو ایک اعلیٰ درجہ کی مضبوط سیرت پیدا کرنے کا واحد ذریعہ ہے ۔ یہی ایمان ہے جس کے ذریعہ سے وہ افراد میں صداقت امانت ، نیک نفسی ، احتساب ، حق پسندی ضبط نفس ، تنظیم ، فیاضی ، وسعت نظر ، خودداری ، انکسار و فروتنی فراخ حوصلگی ، بلند ہمتی ، ایثار و قربانی ، فرض شناسی ، صبر و استقامت ، شجاعت و بسالت ، قناعت و استغناء ، اطاعت امر اور اتباع قانون کے عمدہ اوصاف پیدا کرتا ہے ، اور ان کو اس قابل بناتا ہے کہ ان کے اجتماع سے ایک بہترین سوسائٹی وجود میں آئے ۔

(۶) اس تہذیب کے ایمانیات میں ایک طرف وہ تمام قوتیں موجود ہیں جو انسان کے اندر اخلاق حسنہ و ملکات فاضلہ پیدا کرنے اور ان کی پرورش اور حفاظت کرنے والی ہیں ۔ دوسری طرف ان میں یہ بھی قوت ہے کہ

وہ انسان کو دنیوی ترقی کے لیے ابھارتے ہیں، اس کو اس قابل بناتے ہیں کہ دنیا کے اسباب و وسایل کو بہترین طریقہ پر برتے اور ان تمام قوتوں کو اعتدال کے ساتھ استعمال کرے جو خدا نے اسے عطا کی ہیں، اور اس میں وہ تمام عمدہ صفات پیدا کرتے ہیں جو دنیا میں حقیقی ترقی کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ ان ایمانیات میں انسان کی عملی قوتوں کو منظم کرنے اور تنظیم کے ساتھ حرکت دینے کی زبردست طاقت موجود ہے، اور اس کے ساتھ ہی ایمانیات یہ طاقت بھی رکھتے ہیں کہ اس حرکت کو حد سے تجاوز نہ کرنے دیں، اور ان راستوں سے منحرف نہ ہونے دیں جن سے ہٹ جانا تباہی کا موجب ہوتا ہے۔ اس طرح یہ ایمانیات اپنے اندر وہ تمام خوبیاں مع شئی زائد رکھتے ہیں جو دوسرے مذہبی اور دنیوی ایمانیات میں جداجدا پائی جاتی ہیں، اور ان تمام خرابیوں سے پاک ہیں جو مختلف مذہبی اور دنیوی ایمانیات میں موجود ہیں۔

تہذیب اسلامی میں ایمان کی اہمیت | یہ اس تہذیب کا ایک مجمل خاکہ ہے جس کو اسلام نے قائم کیا ہے۔ اگر ہم تمثیل کے پیرایہ میں اس کو ایک عمارت فرض کرلیں، تو یہ ایک ایسی عمارت ہے جس کو مستحکم کرنے کے لیے نہایت گہری نیو کھودی گئی، پھر چھانٹ چھانٹ کر پختہ سے پختہ اینٹیں مہیا کی گئیں، اور ان کو بہترین چونے سے پیوستہ کر دیا گیا، پھر عمارت اس شان کے ساتھ بنائی گئی کہ بلندی میں آسمان تک اٹھتی چلی جائے۔ وسعت میں آفاق پر پھیلتی چلی جائے، مگر اس وسعت و رفعت کے باوجود اس کے ارکان میں ذرا تزلزل واقع نہ ہو، اس کی دیواریں اور اسکے ستون چٹان کی سی مضبوطی کے ساتھ قائم رہیں۔ اس عمارت کے دروازے اور روشن دان اس طرز پر بنائے گئے ہیں کہ باہر کی روشنی اور صاف ہوا کو بخوبی داخل ہونے دیتے ہیں، مگر گرد و غبار اور خس و خاشاک اور باد و باران کو داخل ہونے سے روک دیتے ہیں۔ یہ تمام خوبیاں جو اس عمارت میں پیدا ہوتی ہیں ایک ہی چیز کی بدولت ہیں، اور وہ ایمان ہے۔ وہی اسکی بنیادیں استوار کرتا ہے: وہی ردی اور ناکارہ مواد کو چھانٹ کر عمدہ مواد اخذ کرتا ہے، وہی موادِ خام کو پکا کر پختہ اینٹیں طیار کرتا ہے، پھر یہی وہ مسالہ ہے جو ان اینٹوں کو پیوستہ کرکے ایک بنیان مرصوص بناتا ہے، اسی پر اس عمارت کی وسعت اور رفعت، اور استحکام کا انحصار ہے، یہی

اس کو پھیلاتا بھی ہے، بلند بھی کرتا ہے، مضبوط بھی کرتا ہے، بیرونی مفسدات سے اس کی حفاظت بھی کرتا ہے، اور پاکیزہ چیزوں کو اس میں داخل ہونے کا موقع بھی دیتا ہے۔ پس ایمان اس عمارت کی جان ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو اس کا قائم رہنا کیسا، وجود میں آنا بھی محال ہے۔ اور اگر یہ ضعیف ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ عمارت کی بنیادیں کمزور، اس کی اینٹیں بودی، اس کا چونا خراب، اس کے ارکان متزلزل ہیں، اس کے اجزاء میں پیوستگی نہیں، اس میں پھیلنے اور بلند ہونے کی صلاحیت نہیں، اس میں بیرونی مفسدات کو روکنے اور اپنی پاکیزگی و نظافت کو محفوظ رکھنے کی قوت نہیں۔

غرض ایمان کا عدم اسلام کا عدم ہے، ایمان کا ضعف اس کا ضعف ہے، ایمان قوت اسکی قوت ہے۔ پھر چونکہ اسلام محض ایک مذہب ہی نہیں بلکہ اخلاق، تہذیب، معاشرت، تمدن، سیاست سب کچھ ہے اسلیے ایمان کی حیثیت اس نظام میں صرف مذہبی عقیدہ ہی کی نہیں بلکہ اسی پر افراد کے اخلاق اور ان کی سیرت کا بھی انحصار ہے، وہی ان کے معاملات کی درستی کا بھی ذمہ دار ہے، وہی ان کو جوڑ کر ایک قوم بھی بناتا ہے، وہی ان کی قومیت اور ان کی تہذیب کی محافظت بھی کرتا ہے، وہی ان کے تمدن، انکی معاشرت، اور انکی سیاست کا مایۂ خمیر بھی ہے۔ ایمان کے بغیر اسلام نہ صرف ایک مذہب کی حیثیت سے قائم نہیں ہو سکتا، بلکہ بحیثیت ایک تہذیب اور تمدن اور نظام سیاسی کے بھی قائم نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ایمان ضعیف ہو تو یہ محض مذہبی عقیدہ کا ضعف نہیں ہے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے اخلاق خراب ہو جائیں، ان کی سیرتیں کمزور ہو جائیں، ان کے معاملات بگڑ جائیں، ان کی معاشرت اور ان کے تمدن کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ ان کے درمیان قومیت کا رشتہ ٹوٹ جائے، اور وہ ایک آزاد اور باعزت اور طاقتور قوم کی حیثیت سے زندہ نہ رہ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں ایمان ہی پر اسلام و کفر کا مدار رکھا گیا ہے اور وہی نظام اسلامی میں داخل ہونے کی اولین شرط ہے۔ سب سے پہلے انسان کے سامنے ایمان ہی پیش کیا جاتا ہے۔ اگر اس نے ایمان کو قبول کر لیا تو امت مسلمہ میں داخل ہو گیا، مسلمانوں کی معاشرت، تمدن، سیاست سب میں برابر کا شریک ہو گیا اور تمام احکام، حدود اور قوانین اس سے متعلق ہو گئے۔ لیکن اگر اس نے ایمان کو قبول نہیں کیا تو دائرۂ اسلامی

میں کسی حیثیت سے داخل نہیں ہو سکتا۔ اسلام کا کوئی حکم اور کوئی قانون اس پر نافذ نہ ہوگا، اور مسلمانوں کی جماعت میں وہ کسی طرح شریک نہ ہو سکے گا، کیونکہ اس نظام میں اسکی کھپت قطعاً محال ہے، اور اس کے قوانین وحدود کی پابندی وہ کر ہی نہیں سکتا۔

نفاق کا خطرہ جو لوگ دعوت ایمان کو علانیہ رد کر دیں۔ ان کا معاملہ تو صاف ہے۔ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان کفر و ایمان کی سرحد اتنی واضح اور نمایاں ہے کہ وہ دائرۂ اسلامی میں داخل ہو کر کوئی خلل برپا نہیں کر سکتے۔ مگر وہ لوگ جو مومن نہیں ہیں اور ایمان کا اظہار کر کے مسلمانوں کی جماعت میں گھس جاتے ہیں، اور وہ جن کے دلوں میں شک کی بیماری ہے، اور وہ جو ضعیف الایمان ہیں، ان کا وجود نظام اسلامی کے لیے نہایت خطرناک ہے، کیونکہ وہ اسلام کے دائرے میں تو داخل ہو جاتے ہیں، مگر اسلامی اخلاق اور اسلامی سیرت اختیار نہیں کرتے، اسلامی قوانین کا اتباع اور حدود الٰہی کی پابندی نہیں کرتے، اپنے خراب اخلاق و اعمال سے مسلمانوں کے تمدن و تہذیب کو خراب کر دیتے ہیں، اپنے دلوں کے کھوٹ سے مسلمانوں کی قومیت اور سیاسی حرمت کی جڑیں کھوکھلی کر دیتے ہیں، اور ہر اس فتنے کے اٹھانے اور بھڑکانے میں حصہ لیتے ہیں جو اسلام کے خلاف اندر یا باہر سے برپا ہوتا ہے قرآن مجید میں ایسے لوگوں کو "منافق" کہا گیا ہے، اور وہ تمام خطرات ایک ایک کر کے بیان کیے گئے ہیں، جو اسلامی جماعت میں ان کے داخل ہو جانے سے پیدا ہوتے ہیں۔

ان کی صفت یہ ہے کہ ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں، مگر حقیقت میں مومن نہیں ہوتے:۔

مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (۲ : ۲)

جو کہتا ہے کہ ہم اللہ اور یوم آخر پر ایمان لائے، حالانکہ وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

وہ مسلمانوں سے مسلمانوں کی سی باتیں کرتے ہیں اور کافروں سے کفار کی سی:۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ (۲ : ۲)

جب وہ ایمان لانے والوں سے ملے تو کہا کہ ہم ایمان لے آئے۔ اور جب اپنے شیاطین کے پاس گئے تو بولے کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔

وہ آیات الٰہی کا مذاق اڑاتے اور ان میں شکوک کا اظہار کرتے ہیں:-

اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ (۴ : ۲)

جب تم سنو کہ اللہ کی آیات کا انکار کیا جاتا ہے اور ان کا مذاق اُڑایا جاتا ہے تو انکے ساتھ نہ بیٹھو۔

وہ مذہبی فرائض سے جی چراتے ہیں، اگر ادا کرتے بھی ہیں تو مجبوراً محض مسلمانوں کو دکھانے کے لیے ورنہ حقیقۃً ان کے دل احکام الٰہی کی اطاعت سے منحرف ہوتے ہیں:-

وَاِذَا قَامُوْا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَاءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَا اِلٰى هٰؤُلَاءِ وَلَا اِلٰى هٰؤُلَاءِ (۴ : ۲۱)

اور جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو با دل ناخواستہ کھڑے ہوتے ہیں محض لوگوں کو دکھاتے ہیں، خدا کو یاد نہیں کرتے، اور اگر کرتے بھی ہیں تو کم۔ وہ بیچ میں مذبذب ہیں، نہ پورے اِدھر ہیں نہ پورے اُدھر۔

وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ (۹ : ۷)

وہ نماز کے لیے نہیں آتے مگر با دل ناخواستہ اور راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے مگر کراہت کے ساتھ۔

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا (۹ : ۱۲)

اعراب میں سے بعض ایسے ہیں کہ جو کچھ راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں اسکو زبردستی کا جرمانہ سمجھتے ہیں۔

وہ اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں مگر اسلامی قوانین کا اتباع نہیں کرتے بلکہ اپنے معاملات میں کفار کے قوانین کی پیروی کرتے ہیں:-

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ (۴ : ۹)

کیا تو نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے اس کتاب پر جو تیرے اوپر اتاری گئی ہے اور ان پر جو تجھ سے پہلے اتاری گئی تھیں مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات شیطانی حاکم کے پاس لے جائیں حالانکہ ان کو حکم دیا جا چکا ہے کہ اس کا حکم نہ مانیں۔

ان کے اعمال خود خراب ہوتے ہیں اور وہ مسلمانوں کے عقائد و اعمال بھی خراب کرنے کی کوشش کرتے ہیں:۔

يَأْمُرُونَ بِالْمُنكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ وَيَقْبِضُونَ أَيْدِيَهُمْ نَسُوا اللَّهَ فَنَسِيَهُمْ (۹ : ۹)

وہ برائی کا حکم دیتے اور بھلائی سے روکتے ہیں اور اپنے ہاتھ نیک کاموں سے کھینچے رہتے ہیں وہ خدا کو بھول گئے اسلیے خدا نے بھی انکو بھلا دیا۔

وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَاءً (۴ : ۱۲)

وہ چاہتے ہیں کہ کاش تم بھی کفر کرو جیسا انھوں نے کفر کیا تاکہ تم اور وہ برابر ہو جائیں۔

وہ مسلمانوں کے ساتھ اسی وقت تک ہیں جب تک ان کا فائدہ ہے۔ جہاں فائدہ گم ہوا اور انھوں نے قوم کا ساتھ چھوڑا۔

وَمِنْهُم مَّن يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا رَضُوا وَإِن لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَا إِذَا هُمْ يَسْخَطُونَ

انمیں سے بعض صدقات کی تقسیم میں تجھ پر طعنہ زنی کرتے ہیں اگر انکو صدقات میں سے دیا گیا تو خوش ہو گئے اور اگر نہ دیا گیا تو بگڑ گئے۔

جب اسلام اور مسلمانوں پر مصیبت کا وقت آتا ہے تو وہ جنگ سے انکار کر دیتے ہیں کیونکہ حقیقت میں تو انکو اسلام سے محبت ہی نہیں ہے کہ اسکے لیے کوئی قربانی کریں، نہ وہ اس قربانی پر کسی اجر کے قائل ہوتے ہیں نہ انکو اسلام کی حقانیت کا یقین ہوتا ہے کہ اسکی تائید میں جان دینے پر آمادہ ہوں۔ وہ طرح طرح سے اپنی جان بچانے کی کوشش کرتے ہیں، اور اگر جنگ میں شریک بھی ہوتے ہیں تو بادل ناخواستہ بلکہ انکی شرکت مسلمانوں کے لیے قوت کے بجائے ضعف کا سبب بن جاتی ہے۔ انکی اس کیفیت کو سورۂ آل عمران (رکوع ۱۲-۱۷) سورۂ نساء (رکوع ۱۰-۱۱-۱۲-۲۰) سورۂ توبہ (رکوع ۷-۱۱-۱۲) اور سورۂ احزاب (رکوع ۲) میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

انکی سب سے زیادہ خطرناک صفت یہ ہے کہ جب مسلمانوں پر مصیبت آتی ہے تو کفار سے مل جاتے ہیں ان کو خبریں پہونچاتے ہیں ان سے ہمدردی کرتے ہیں، مسلمانوں کی مصیبت پر خوش ہوتے ہیں اپنی قوم سے غداری کر کے کفار سے اعزاز اور مناصب حاصل کرتے ہیں، ہر فتنہ جو اسلام کے خلاف اٹھتا ہے اسمیں سب سے آگے بڑھ کر حصہ لیتے ہیں، اور مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ ڈالنے کے لیے سازشیں کرتے رہتے ہیں ان صفات کو بھی آل عمران، نساء، توبہ، احزاب، اور منافقون میں مفصلاً بیان کیا گیا ہے۔

اس سے اچھی طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نظام اسلامی کے قیام و بقاء و استحکام کے لیے صحیح اور خالص ایمان ناگزیر ہے ایمان کی کمزوری اس نظام کو جڑ سے لیکر آخری شاخ تک کھوکھلا کر دیتی ہے اور اسکے خطرناک اثرات سے اخلاق، معاشرت، تمدن، تہذیب، سیاست کوئی چیز نہیں بچ سکتی۔

کتب سماوی پر ایک نظر

(۹)

عہد جدید (اناجیل وغیرہم)

(از جناب ذوقی شاہ صاحب)

عقیدۂ تثلیث کے اسباب اور اُن پر ناقدانہ نظر کتب عہد جدید کے تعلیم تثلیث سے معرا ہونے کی بابت پہلے بحث کی جا چکی ہے۔ آیئے اب عیسائی علماء کے اقوال پر نظر ڈالکر یہ معلوم کریں کہ ان لوگوں کو الوہیت مسیح کا مغالطہ کن اسباب سے ہوا اور وہ اسباب معقول پسند نگاہوں میں کیا وقعت رکھتے ہیں۔

اگر مغالطہ کا باعث یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام روح القدس کے وسیلہ سے پیدا ہوئے (متی ۱: ۱۸) تو حضرت سارہ اور حضرت ربقہ دونوں بانجھ تھیں اور قوائے انسانی کے ذریعہ توالد و تناسل کی امید دونوں سے مفقود ہو چکی تھی۔ صرف خدا کے حکم سے اسحٰق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام پیدا ہوئے (پیدایش ۱۸: ۱۱-۲۱،۲۵) حضرت یحییٰ کے پیدا ہونے کی بھی یہی شان ہے (لوقا ۱)

بضلی ایل بن اوری کو بھی خدا روح اللہ فرما چکا ہے (خروج ۳۱: ۲ و ۳) پھر عیسیٰ علیہ السلام کے لیے اس معاملہ میں کیا خصوصیت رہی ؟

اگر مغالطہ کا باعث یہ ہے کہ مسیح بے باپ کے پیدا ہوئے تو ثبوت الوہیت کے لیے یہ بات کافی نہیں اگر ماں کے پیٹ سے پیدا ہونا الوہیت کے منافی نہیں تو ماں اور باپ دونوں سے پیدا ہونا بھی الوہیت کے منافی نہیں ہو سکتا۔ عیسائی علماء، حضرت عیسیٰ کو پورا خدا بھی کہتے ہیں اور پورا انسان بھی۔ لیکن از روئے عقل وہ پورے

انسان اسی صورت میں ہو سکتے ہیں جبکہ اوصاف انسانی سے پورے طور پر متصف ہوں اور ماں اور باپ دونوں سے پیدا ہوئے ہوں۔ علاوہ بریں عیسائی عقیدہ کے مطابق پورے انسان کے لیئے ضروری ہے کہ سب انسانوں کی طرح وہ بھی گنہ گار ہو (رومیون ۳: ۹ تا ۱۲) اگر مسیح پورے انسان نہ تھے جو کہ ایک آسان تر کام ہے تو وہ پورے خدا کیسے ہو سکتے تھے جو کہ مشکل تر کام ہے؟ پھر یہ بھی غور طلب مسئلہ ہے کہ جب مسیح کے بے باپ کے پیدا ہونے پر الوہیت کا ان پر گمان ہو سکتا ہے تو آدم علیہ السلام پر یہ گمان کیوں نہ ہوا جو کہ بے ماں اور بے باپ کے پیدا ہوئے اور جنہیں خدا نے اپنی صورت پر پیدا کیا (پیدائش ۱: ۲۷) حوا علیہا السلام کا پیدا ہونا بھی کچھ کم تعجب خیز نہیں کیونکہ وہ بغیر ماں کے پیدا ہوئیں۔

ملک صدق کا حال بھی عجیب و غریب ہے جو توریت اور انجیل دونوں میں موجود ہے۔ عبرانیوں کے باب ۷ آیہ ۳ میں ہے کہ

> "یہ (یعنی ملک صدق) بے باپ بے ماں۔ بے نسب نامہ جس کے نہ دنوں کا شروع نہ زندگی کا آخر مگر خدا کے بیٹے سے مشابہ ٹھیر کے ہمیشہ کاہن رہتا ہے"

توریت میں (پیدائش ۱۴: ۱۸ تا ۲۰) اور زبور (۱۱۰: ۴) میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ علمائے اہل کتاب کے بیانات اسکے احوال میں بہت مختلف ہیں بعض کہتے ہیں کہ وہ ایک فرشتہ تھا اور بعض کہتے ہیں کہ وہ خود مسیح ہی تھا جو اسوقت بھی ظاہر ہوا۔ مگر یہ دونوں گمان غلط ہیں کیونکہ اگر وہ فرشتہ ہوتا تو کہانت سے اوسکو کیا تعلق اور خود اپنی ذات سے مسیح ہوتا تو مسیح کے مشابہ یا مسیح کے مانند ہونے کے کیا معنی؟ علمائے یہود کہتے ہیں کہ وہ نوح علیہ السلام کا دوسرا بیٹا سام تھا۔ مگر عبرانیوں کے خط کی رو سے یہ بھی غلط ہے کیونکہ اس خط میں تو ملک صدق کا بے باپ بے ماں اور بے نسب نامہ کے ہونا لکھا ہے مگر سام کے باپ کا نام نوح تھا اور اس کا نسب نامہ توریت میں درج ہے۔ بہر حال ملک صدق فرشتہ نہ تھا بلکہ ایک انسان تھا اور بقول انجیل کے اوس کے نہ باپ تھا نہ ماں نہ نسب نامہ حالانکہ عیسیٰ علیہ السلام کے ماں بھی تھیں اور آپ کا نسب نامہ اناجیل میں دو موقعوں پر درج ہے۔

اگر مغالطہ کا باعث یہ ہے کہ انجیل میں جابجا عیسیٰ علیہ السلام کے لیئے خدا کا لفظ آیا ہے تو اول تو اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ جہاں یہ لفظ آیا ہے وہاں اصلی عبرانی یا یونانی قدیم نسخوں میں بھی اسی طرح وارد ہوا ہے چنانچہ

اول متطاؤس باب ۳ آیہ ۱۶ میں یہ وارد ہوا ہے کہ "خدا جسم میں ظاہر کیا گیا"، اس کے متعلق گریسباخ کی تحقیقات یہ ہے کہ اس آیت میں لفظ "خدا" کی جگہ "وہ" کا لفظ اصلی نسخوں میں ہے یعنی یوں ہونا چاہیئے کہ "وہ کہ جسم میں ظاہر کیا گیا"، جس طرح یہاں کسی خداگر نے "خدا" کا لفظ الحاق کر دیا اسی طرح دوسرے مقامات پر بھی الحاق واقع ہوا ہو تو اب کوئی کیسے جان سکتا ہے۔ دوسرے یہ امر بھی قابل غور ہے کہ عبرانی محاورہ میں اس زمانہ میں قاضیوں اور مفتیوں کو بھی خدا کہتے تھے۔ اسکاٹ صاحب بھی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ کلام الہٰی میں مجسٹریٹ خدا کہلاتے تھے اور یہ لقب انھیں اس لیے دیا گیا تھا کہ وہ لوگوں میں خدا کے نائب تھے۔ چنانچہ کتب مقدسہ قدیم وجدید میں خدا کے لقب سے بندے متعدد جگہ مخاطب کئے گئے ہیں چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

"خدا کی جماعت میں خدا کھڑا ہے الہٰوں کے درمیان وہ عدالت کرتا ہے" (زبور ۱:۸۲)

"میں نے تو کہا کہ تم سب الٰہ ہو اور تم سب حق تعالیٰ کے فرزند ہو" (زبور ۶:۸۲)

"میں نے تو کہا تم سب خدا ہو" (یوحنا ۱۰: ۳۴)

"جبکہ اس نے انہیں جن کے پاس خدا کا کلام آیا خدا کہا" (یوحنا ۱۰: ۳۵)

"پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا دیکھ میں نے تجھے فرعون کے لیے خدا سا بنایا اور تیرا بھائی ہارون تیرا پیغمبر ہوگا" (خروج ۷: ۱)

"اور تو (اے موسیٰ) اُس کے لیے (یعنی ہارون کے لیے) خدا کی جگہ ہوگا" (خروج ۴: ۱۶)

"سارہ ابراہام کی فرمانبرداری کرتی اور اسے خداوند کہتی تھی" (۱۔پطرس ۳: ۶)

یوسف علیہ السلام نے اپنی بابت فرمایا کہ:۔

"خدا نے مجھ کو سارے مصر کا خداوند کیا" (پیدائش ۴۵: ۹)

ان مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ توریت و انجیل میں "خدا" اور "خداوند" کے الفاظ عبداور معبود دونوں کے

حق میں استعمال ہوئے ہیں اور یہ الفاظ صرف عیسیٰ علیہ السلام ہی کے لیے مخصوص نہ تھے بلکہ دیگر بندگان خدا کے حق میں بھی استعمال ہوئے ہیں اور ان الفاظ کے استعمال سے اُن لوگوں کی عبدیت میں فرق نہیں آتا اور اُن میں الوہیت ثابت نہیں ہوتی۔

اگر اس مغالطہ کا باعث یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے کو خدا کا بیٹا کہا ہے (یوحنا ۱۰: ۳۶ متی ۱۳:۲۷) تو انجیل میں ساٹھ (۶۰) مقامات پر آپ اپنے کو ابن آدم بھی فرما چکے ہیں۔ جبکہ انجیلی اصطلاح میں (جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے) ہر شخص خدا ہے تو ہر انسان کا بیٹا بھی اس اصطلاح کے مطابق خدا کا بیٹا قرار پانا چاہیئے۔ غالباً عیسیٰ علیہ السلام کو یہ اندیشہ پیدا ہوا ہوگا کہ لوگ آپ کو بجائے خدا کا اصطلاحی بیٹا ہونے کے حقیقی بیٹا نہ سمجھنے لگیں اس لیے آپ نے اپنے آپ کو بار بار ابن آدم کہا تاکہ لوگ متنبہ رہیں اور آپ کو الوہیت سے متصف نہ کرنے لگیں۔ بائیبل میں جہاں عام طور پر لوگوں کو خدا کا بیٹا کہا گیا ہے وہاں خاص خاص بندوں کے لیے بھی یہ پیار کا خطاب خاص طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ **ایوب** (۱: ۶ اور ۲: ۱) کی تفسیر میں **اسکاٹ** صاحب لکھتے ہیں کہ یہاں "خدا کے بیٹوں" سے مراد پاک فرشتے ہیں۔ اور **ایوب** (۳۸: ۷) کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ مفسرین کے نزدیک یہاں "خدا کے بیٹوں" سے مراد انبیاء ہیں۔ **عبرانیوں** کے خط (۱: ۶) میں آدم علیہ السلام کو "خدا کا پہلوٹھا" بیان کیا گیا ہے۔ **لوقا** کے باب ۳ میں جو نسب نامہ درج ہے اُس کے آخر میں جہاں آدم کا نام آیا ہے وہاں آدم علیہ السلام کو خدا کا بیٹا لکھا ہے۔ **پیدائش** (۶: ۲) میں آدم علیہ السلام کے بیٹوں کو خدا کے بیٹے کہا گیا ہے۔ **گلتیون** کے خط (۴: ۲۸) میں اسحٰق علیہ السلام "وعدے کے فرزند" بیان کئے گئے ہیں۔ **خروج** (۴: ۲۲) کی رو سے اسرائیل خدا کا پہلوٹھا اور پیارا بیٹا ہے۔ **یرمیاہ** (۳۱: ۹ و ۲۰) کے مطابق افرائیم خدا کا پہلوٹھا اور پیارا بیٹا ہے۔ **زبور** (۸۹: ۲۶ تا ۲۷) میں حضرت داؤد علیہ السلام کو بھی خدا کا بڑا بیٹا کہا گیا ہے۔ **اول تواریخ** (۲۲: ۱۰ اور ۲۸: ۶) اور **۲ سموائیل** (۷: ۱۴) کی رو سے سلیمان علیہ السلام خدا کے فرزند ہیں۔ **استثناء** (۱۴: ۱) اور رومیوں کے خط (۹: ۴) کے بموجب جملہ اسرائیلی فرزندان خدا ہیں۔ رومیوں کے خط (۸: ۱۶) کی سند پر جملہ عیسائی فرزندان الٰہی ہیں۔ متی (۶: ۹ و ۱۸ اور

۷:۱۱) میں ہر خاص وعام کو خدا کا فرزند قرار دیا گیا ہے۔ اور یسعیاہ (۳۰:۱) کی عبارت گنہ گار لوگوں کو بھی خدا کا فرزند ظاہر کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی فرزندی سے الوہیت کو کیا تعلق ہو سکتا ہے عیسیٰ علیہ السلام کے لئے ابنیت کا خطاب مختص نہ تھا اور اس سے آپ کی الوہیت ثابت نہیں ہوتی۔

اگر اس مغالطہ کا باعث یہ ہے کہ یسوع کے لفظی معنی نجات دہندہ کے ہیں تو موسیٰ علیہ السلام کے جانشین حضرت یشوع علیہ السلام کے نام کے بھی یہی معنی ہیں اور حضرت یسعیاہ کے نام کے معنی خدا کی نجات کے ہیں لہٰذا معنی کے لحاظ سے اس نام میں بھی کوئی خصوصیت نہ رہی۔

اگر مغالطہ کا باعث یہ ہے کہ آپ کا شفیع ہونا دلیل الوہیت سمجھ لیا گیا ہے تو زبور (۹۹:۶) اور یرمیاہ (۱۵:۱) میں حضرت موسیٰ اور حضرت سموئیل کو اور حزقی ایل (۱۴:۲۰) میں حضرت نوح حضرت دانیال اور حضرت ایوب کو بھی شفیع کہا گیا ہے۔ اور پیدائش (۱۸:۲۳ تا ۳۳) میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھی شفاعت کرنے کا ذکر موجود ہے۔

اگر الوہیت مسیح کا گمان اس امر پر مبنی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے مردے زندہ کر دیئے تو بائبل ہی میں اول سلاطین (۱۷:۲۲) میں ملاحظہ فرما لیجئے کہ حضرت الیاس نے بھی ایک مردہ لڑکے کو زندہ کر دیا تھا دوم سلاطین کے باب ۴ میں حضرت الیشع کا یہ عجیب وغریب واقعہ درج ہے کہ آپ نے ایک عورت سے جس کا شوہر بوڑھا تھا فرمایا کہ تو اسی وقت سے حساب شمار کرنا شروع کر دے اور جب دن پورے ہو جائیں گے تو ایک بیٹا تو گود میں لے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس معجزۂ عجیبہ کی برکت سے وہ عورت اپنے بوڑھے شوہر کے پاس گئی بھی نہ تھی کہ حمل شروع ہو گیا اس لڑکے کا شمار بھی ان ہی لڑکوں میں کرنا چاہیئے جو بے باپ کے پیدا ہوئے پھر جب جوان ہو کر یہ لڑکا مر گیا تو حضرت الیشع نے اسے زندہ بھی کر دیا۔ اسی کتاب یعنی دوم سلاطین کے ابواب ۴ و ۵ و ۶ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ الیشع علیہ السلام نے اور بھی عجیب وغریب معجزات کا اظہار فرمایا مثلاً بیس روٹیوں اور ایک ٹوکری بھر اناج کی بالوں سے ننانوے انبیازادوں کو پیٹ بھر کے کھانا کھلا دیا اور بچ رہا

ایک مبروص کو برص کی بیماری سے صحت دیدی - ایک تندرست شخص کو مبروص بنا دیا - لوہے کو پانی پر تیرا دیا عیسیٰ علیہ السلام نے تو اپنی اس دنیا ہی کی زندگی میں مردوں کو زندہ کیا تھا مگر دوم سلاطین (۱۳ : ۲۱) کے بموجب حضرت الیشع کی مدفون لاش اور مردہ ہڈیوں نے ایک مردہ کو زندہ کر دیا - اعمال (۹ : ۳۶ تا ۴۳) میں درج ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے حواری پطرس نے بھی ایک مردہ عورت کو جس کا نام تابیتھا تھا - زندہ کر دیا - اعمال (۲۰ : ۹ تا ۱۲) میں ایک واقعہ درج ہے کہ ایک لڑکا کوٹھے پر سے گر کے مر گیا تھا جس کا نام یوتخس تھا - اوسے پولوس نے زندہ کر دیا - جب بائیبل ہی نے مُردوں کے زندہ کرنے کا سہرا اتنے بہت سے سروں پر باندھ دیا تو یہ صفت کسی کے لیے الوہیت کی دلیل کیسے ہو سکتی ہے - عیسائیوں کا کہنا ہے کہ مسیح نے جو معجزے دکھلائے وہ اپنی قدرت سے دکھلائے اور دوسرے نبیوں نے جو معجزے دکھلائے وہ مسیح کی طرف سے یعنی مسیح کی بخشی ہوئی قدرت سے دکھلائے مگر یہ لوگ اپنے اس قول کی تائید میں کوئی معقول دلیل پیش نہیں کرتے - یہ صرف اُن کا خیال ہی خیال ہے اور موجودہ تحریف شدہ بائیبل میں بھی اُن کے اِس خیال کی تائید میں ایک لفظ تک نہیں ملتا - نبیوں کے ہاتھ پر اللہ کی قدرت سے معجزات کا ظہور ہوتا رہتا ہے مگر اظہار معجزہ اظہار نبوت کے لیے لازمی نہیں - جب معجزات دلیل نبوت نہیں تو دلیل الوہیت کیونکر ہو سکتے ہیں ؟

اگر اس مغالطہ الوہیت کا باعث یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح کہتے ہیں تو اس معاملہ میں بھی آپ تنہا نہیں - کیونکہ توریت کے بکثرت مقامات سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر نبی اور بنی اسرائیل کا ہر بادشاہ اور کاہنوں کا سردار ممسوح ہوتا تھا اور مسیح کیا جاتا تھا - چنانچہ دوم سموئیل (۱ : ۱۴) میں ساؤل کو مسیح کہا گیا - اول سموئیل (۱۶ : ۱۳) اور دوم سموئیل (۲۳ : ۱) میں داؤد علیہ السلام کو مسیح لکھا گیا - یسعیاہ (۴۵ : ۱) میں کیخسرو بادشاہ فارس کو خدا کا مسیح بیان کیا گیا - حضرت یسعیاہ نبی نے اپنی کتاب (۶۱ : ۱) میں خود اپنی بابت تحریر فرمایا ہے کہ "خدا نے مجھے مسیح کیا" دوم سلاطین (۹ : ۱ تا ۶) میں یاہو کو اور (۲۳ : ۳۰) میں یہواخز کو مسیح لکھا گیا - دوم قرنتیوں کے خط (۱ : ۲۱) میں حضرت پولوس بھی اپنی شان میں تحریر فرماتے ہیں کہ :-

"جس نے ہم کو مسوح کیا سو خدا ہے"

اگر مغالطہ کا باعث یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ اٹھا لیے گئے تو **پیدائش** (۵ : ۲۴) سے حنوکؑ اور دوم **سلاطین** (۲ : ۱۱) سے حضرت **الیاس** کا آسمان پر زندہ اٹھالیا جانا بھی ثابت ہے۔ **قرنتیون** کے دوسرے خط (۱۲ : ۲ تا ۴) میں پولوس بھی تیسرے آسمان تک اور فردوس بریں تک اپنی اسی دنیا کی زندگی میں پہونچایا جانا بیان فرماتے ہیں۔ رومن کیتھولک فرقہ کے نزدیک حضرت مریم بھی آسمان پر اٹھائی گئیں۔ یہ لوگ حضرت مریم سے بھی دعائیں مانگتے ہیں اور انہیں بہشت کی ملکہ کہتے ہیں۔

عیسائی یہ بھی کہتے ہیں کہ جب زبدی کے بیٹوں کی ماں نے عیسیٰ علیہ السلام کو سجدہ کیا (متی ۲۰ : ۲۰) تو آپ نے اُسے سجدہ کرنے سے منع نہ فرمایا اور یہ آپ کی الوہیت کی دلیل ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ انجیلی محاورہ میں سجدہ سے اکثر خوشامد یا فرمانبرداری مراد ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی معنی میں **مکاشفات** (۳ : ۷ تا ۹) میں آیا ہے کہ یہودی فلادلفیا کے کلیسہ کے پادریوں کے پاؤں پر آکر سجدہ کریں گے۔ جب اس سجدہ سے پادریوں میں الوہیت ثابت نہیں ہوتی تو زبدی کے بیٹوں کی ماں کے سجدہ کرنے سے مسیح کی الوہیت کیسے ثابت ہو سکتی ہے؟ بنت سبع نے داؤد علیہ السلام کو سجدہ کیا (اول **سلاطین** ۱ : ۱۶) ساؤل کے پوتے مفیبوست نے داؤد علیہ السلام کو سجدہ کیا (۲ سموائیل ۹ : ۶ و ۸) کوشی نے داؤد علیہ السلام کے سپہ سالار یوآب کو سجدہ کیا (۲ سموائیل ۱۸ : ۲۱) اخیمعض نے بادشاہ داؤد کے آگے سجدہ کیا (۲ سموائیل ۱۸ : ۲۸) شاہ بنوکدنضر یعنی بخت نصر اوندھے منہ گرا اور دانیال کے آگے اُس نے سجدہ کیا (دانیال ۲ : ۴۶) روت جو کہ مسیح کی پردادیوں میں سے تھیں بوعز کے سامنے زمین پر سجدہ میں گریں (روت ۲ : ۱۰) **بائیبل** میں اس قسم کی بکثرت مثالیں موجود ہیں۔ کیا یہ سب لوگ جن کے آگے سجدے ہوئے مستحق الوہیت ہو گئے ہیں؟ ایک اور مثال سن لیجئے جہاں ایسے شخص کے آگے سجدہ کرایا جاتا ہے جو بت پرست تھا اور خدا سے ناواقف تھا۔ ایسے شخص کے متعلق الوہیت کا گمان کسی صورت سے ہو ہی نہیں سکتا۔ کورس بادشاہ یعنی کیخسرو کی بابت یسعیاہ (۴۵ : ۴) میں خدا فرماتا ہے کہ تو مجھ کو

نہیں جانتا۔ پھر اگلی آیت میں فرماتا ہے کہ میں نے تیری کمر باندھی اگرچہ تو نے مجھے نہ پہچانا۔ اسی کورس اپنی کیخسرو سے
یسعیاہ کے باب ۴۵ ہی کی آیہ ۱۴ میں یہ خطاب ہوتا ہے کہ:۔

"خداوند یوں فرماتا ہے کہ مصر کی دولت اور کوش کا منافع اور سبا کے قد آور لوگ تیرے
پاس آویں گے اور تیرے ہو ویں گے اور تیری پیروی کریں گے۔ وے بیڑیاں پہنے
ہوئے اپنا ملک چھوڑ کے آویں گے اور تیرے آگے سجدہ کریں گے وے تیرے آگے منت کرینگے"

صاف ظاہر ہے کہ یہاں سجدہ سے مراد منت و خوشامد ہے۔ عبرانی انداز بیان اسی طور پر واقع ہوا ہے کہ ایک ہی مضمون کو دو مختلف طور پر بیان کیا جاتا ہے حالانکہ مقصد دونوں بیانوں کا ایک ہی ہوتا ہے۔ مثلاً اقتباس بالا میں "تیرے آگے سجدہ کریں گے وے تیرے آگے منت کریں گے"۔ یہاں عبرانی محاورہ کے مطابق سجدہ کرنے اور منت کرنے کے ایک ہی معنی ہیں اس طرح سے یہاں سجدہ کے معنی کو سمجھایا ہے۔

بعض عیسائی علماء کی جسارت آپ نے ملاحظہ فرمائی۔ اب ذرا مسیح علیہ السلام کے انکسار و عبدیت کی بھی سیر کیجئے۔ آپ فرماتے ہیں کہ:۔

"میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ نوکر اپنے آقا سے بڑا نہیں اور نہ وہ جو بھیجا گیا ہے اپنے بھیجنے والے سے اگر تم یہ باتیں سمجھتے اور ان پر عمل کرتے ہو تو مبارک ہو" (یوحنا ۱۳: ۱۵ اور ۱۶ اور ۱۷)

مسیح نے شمعون سے فرمایا کہ:۔

"میں نے تیرے لیے دعا مانگی کہ تیرا ایمان جاتا نہ رہے"۔ (لوقا ۲۲: ۳۲)

اللہ سے دعا مانگنا عین عبدیت ہے۔

آسمان پر جانے سے قبل مسیح نے مریم سے کہا:۔

"مجھ کو مت چھو کیونکہ میں ہنوز اوپر اپنے باپ کے پاس نہیں گیا پر میرے بھائیوں (یعنی حواریوں) پاس جا اور ان سے کہہ کہ میں اوپر اپنے باپ اور تمہارے باپ پاس اور

اپنے خدا اور تمہارے خدا پاس جاتا ہوں" (یوحنا ۲۰: ۱۷)

مسیح علیہ السلام کے اس قول سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ خدا کی نسبت باپ کے لفظ کا استعمال اس زمانہ کا عام محاورہ تھا۔

"میں نے تو آپ سے نہیں کہا بلکہ باپ نے جس نے مجھے بھیجا فرما دیا کہ میں کیا بولوں اور کیا کہوں"

(یوحنا ۱۲: ۴۹)

حاصل یہ ہے کہ اناجیل مروجہ سے بھی ثابت نہیں ہوتا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی الوہیت کا دعویٰ کیا ہو، اور تثلیث کی تعلیم دی ہو بلکہ خالص توحید ہی کی تعلیم آپ دیتے رہے اور اپنے کو اللہ کا بندہ اور پیغمبر کہتے رہے آپ کے حواریوں نے بھی آپ کو صرف نبی ہی سمجھا اور نبی ہی مانا۔ آپکے زمانہ کے لوگوں نے بھی آپ کو نہ الوہیت سے موصوف کیا نہ الوہیت سے آپ کو موصوف کرتے ہوئے کسی کو دیکھا یا سنا۔ آپکے دشمنوں تک نے آپ پر یہ الزام اس زمانہ میں نہ لگایا کہ آپ نے کبھی الوہیت کا دعویٰ کیا۔ تثلیث کو آپ کی تعلیم سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ بہت بعد کی بدعت ہے۔ ۳۲۵ء میں اس عقیدہ کی بنیاد مندرجہ ذیل صورت سے ڈالی گئی:۔

جارج سیل اپنے ترجمہ قرآن کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ ۳۲۵ء میں کونسل نیس منعقد ہوئی اور اس میں مسیح کی الوہیت کا، جس کی مدت سے گفتگو درپیش تھی، تصفیہ ہوا۔ اس کونسل کے انعقاد کی وجہ یہ تھی کہ جب آریوس نے جو مسیح کی الوہیت کا منکر تھا اپنے مسئلہ کو دونوں یوسی بیوسیلوں اور دیگر علماء کی مدد سے خوب پھیلانا شروع کیا اور اتھانیشیس اوس کے مقابلہ پر کھڑا ہوا تب قسطنطین نے اس نزاع کو دیکھ کر اس کونسل کے انعقاد کا حکم دیا۔ اس کونسل میں تیرہ (۱۳) بشپ اور بہت سے پادریوں نے تثلیث سے انکار کیا۔ بعض لوگ تثلیث کے تو قائل ہو گئے مگر بجائے روح القدس کے حضرت مریم کو تثلیث میں داخل کرتے تھے۔ جب بادشاہ نے علانیہ حکم دے دیا کہ جو شخص تثلیث سے انکار کرے گا اس کا مال ضبط اور وہ خود جلاوطن کیا جائے گا۔ تب اکثر اراکین کونسل نے بادشاہ کے خوف سے تثلیث کے عقیدہ پر دستخط کر دیئے۔ بس اُس وقت سے تثلیث قائم ہوئی اور

اتھانیشیس کا عقیدہ پھیلنا شروع ہوا۔

رومن تواریخ کلیسہ کے باب ۵ میں کونسل آف نیس کے متعلق لکھا ہے کہ اس دینی مباحثہ کے سبب بہت لوگ ستائے گئے بلکہ جان سے مارے گئے اور بڑی خونریزی کی لڑائیاں ہوئیں۔

جان ڈیون پورٹ اپنی کتاب کے صفحہ ۱۶۰ پر لکھتے ہیں کہ:۔

"قسطنطین اعظم نے صرف اپنے ملک کے استحکام کے لیے مذہب عیسائی اختیار کیا تھا اور یہ شخص ایسا ظالم تھا کہ لوگ اسے نیرو ثانی کہتے تھے۔اس کے ہاں ایک مشہور انجمن تھی جسکو نیس کہتے تھے۔ اس مجلس نے پہلے پہل ۳۲۴ء میں حضرت مسیح کی خدائی کا مسئلہ نکالا"

سینٹ ہلیری جو چوتھی صدی کا ایک بشپ اور اگلے زمانہ کے پادریوں میں سے تھا ان مذہبی مناقشات کو بہت ناپسند کرتا تھا جن کے باعث ہزار ہا عیسائی جان سے مارے گئے اور جن لوگوں کو آپس میں بھائی بنکر رہنا چاہیے تھا انھوں نے آپس میں ایک دوسرے پر ظلم کیا۔اُس کے الفاظ یہ ہیں کہ:۔

"بڑے افسوس کی اور خوف کی بات ہے کہ ہم لوگوں میں جس قدر رائیں ہیں اُسیقدر مسائل اور جیسا جس کا میلان ہے ویسا ہی اُس کا مذہب اور جتنی ہم میں کوتاہیاں ہیں اُتنی ہی ہماری کفر گوئی اور بےادبی ہے کیونکہ ہم لوگ اپنے دل کی خواہش کے مطابق مسائل بنا لیتے ہیں پھر اُن مسائل کو اسی طرح بناوٹ سے بیان کرتے پھرتے ہیں۔ہر سال نہیں بلکہ ہر مہینہ ہم جدید مذاہب تراشتے ہیں اور ان کی اشاعت کرتے ہیں"

فلٹن صاحب کا قول ہے کہ:۔

"قسطنطین کے زمانہ سے بہت پہلے اکثر عیسائی خراب ہو گئے تھے اور اصول مذہب میں فتور آگیا تھا مگر بعد ازاں جب اُس نے علمائے مذہب کی بہت قدر کی اور انہیں اعلیٰ اعلیٰ مرتبوں پر پہنچایا تو یہ لوگ دولت کے خواہش مند اور اختیارات ملکی کے شائق ہو گئے اور انھوں نے

مذہب عیسوی کو خراب کر دیا،،

قسطنطین کے فیصلۂ تثلیث کے باوجود اور باوجود دردناک خونریزیوں کے آریوس اپنے ہی عقیدہ توحید پر جما رہا اور اپنے عقیدہ کی لوگوں کو تعلیم بھی دیتا رہا۔ اُس کے بعد بھی عرصہ تک یہ تعلیم جاری رہی اور اب بھی عیسائیوں میں **یونی ٹیرین** فرقہ موجود ہے جو تثلیث کا قائل نہیں، الوہیت صرف خدا کے لیے قرار دیتا ہے اور مسیح کو ایک الہام یافتہ انسان سمجھتا ہے۔ ایام گزشتہ میں عیسائیوں میں ایک **آبیونی** فرقہ تھا جس کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ محض ایک انسان تھے۔ سنہ ۲۰۰ء میں **آرٹمن** فرقہ پیدا ہوا اُس کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ مسیح انسان ہیں۔ **سا آسینین** فرقہ والے بھی مسیح کو صرف انسان اور الہام یافتہ سمجھتے تھے۔

مراتب ثلاثہ عیسائی علماء یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ جس طرح مسیح اقانیم ثلاثہ میں سے ایک اقنوم ہیں اسی طرح اس ایک اقنوم میں بھی تین مرتبے شامل ہیں یعنی نبوت بادشاہت اور کاہنوں کی سرداری۔ مگر انجیل سے سوا مرتبۂ نبوت کے اور کوئی مرتبہ عیسیٰ علیہ السلام میں ثابت نہیں ہوتا چنانچہ **یوحنا** (۱۸: ۳۶) میں ہے کہ :-

"یسوع نے جواب دیا کہ میری بادشاہت اس جہان کی نہیں اگر میری بادشاہت اس جہان کی ہوتی تو میرے نوکر لڑائی کرتے تاکہ میں یہودیوں کے حوالہ نہ کیا جاتا پر میری بادشاہت یہاں کی نہیں ہے"

کاہن کے عہدہ یا کاہنوں کی سرداری پر آپ کا مقرر نہ ہونا جملہ اناجیل و حالات مسیح سے ثابت ہے۔ صرف مرتبۂ نبوت کا ثبوت اناجیل موجودہ میں بھی بکثرت پایا جاتا ہے۔ چنانچہ مسیح علیہ السلام خود اپنی بابت **مرقس** (۶: ۴) میں فرماتے ہیں کہ :-

"نبی بے عزت نہیں مگر اپنے وطن میں،،

آپ کے اس قسم کے الفاظ جن سے آپ کی نبوت کا آپ ہی کی زبان سے اقرار پایا جاتا ہے **متی** (۱۳: ۵۷) اور **لوقا** (۴: ۲۴) اور **یوحنا** (۴: ۴۴) میں بھی موجود ہیں۔ حواریوں نے قصۂ صلیب کے بعد بھی آپ کو نبی ہی کہا۔

(لوقا ۲۴: ۱۹) جب آپ نے ایک بیوہ کے مردہ لڑکے کو زندہ کر دیا تو سب ڈر گئے اور خدا کی تعریف کر کے بولے کہ:۔

"بڑا نبی ہم میں اُٹھا"، (لوقا ۷: ۱۱-۱۶)

جب آپ نے پانچ ہزار آدمیوں کو پانچ روٹیوں سے سیر کر دیا تو ان لوگوں نے کہا کہ:۔

"فی الحقیقت وہ نبی جو جہان میں آنے والا تھا یہی ہے"، (یوحنا ۶: ۱۴)

غرضکہ آپ نے خود اپنے آپ کو صرف نبی ہی فرمایا۔ آپ کے حواریوں نے آپ کے اٹھ جانے کے بعد بھی آپ کو نبی ہی جانا۔ اور عوام الناس میں سے جن جن سے آپ کو سابقہ پڑا انھوں نے آپ کو نبی ہی سمجھا۔ جس طرح توحید الٰہی میں اقانیم ثلاثہ ثابت نہیں ہوتے۔ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام میں مرتبہ نبوت کے ساتھ بادشاہت اور کہانت کا اجتماع بھی ثابت نہیں ہوتا۔   (باقی)

تنزیل و تاویل

سورۂ فاتحہ

(۲)

(از جناب مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی)

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ

ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں

(۱) انتہائی عظمت و جلال کی وجہ سے انتہائی تذلل اختیار کرنا عبادت کہلاتا ہے اس وجہ سے کہ عبادت اختیاری تذلل کا نام ہے۔ فقہاء کرام نے عبادت کے لیے نیت و ارادہ کا ہونا بالاجماع شرط قرار دیا ہے۔ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کمال محبت کے ساتھ کمال خضوع اور غایت انقیاد و اطاعت کا نام عبادت ہے۔ کمال محبت کے یہ معنی ہیں کہ قلب اُس رب العالمین کی محبت سے لبریز ہو اُس کی محبت نے باقی تمام محبتوں کو قلب سے منسوخ کر دیا قلب میں اس کے سوا کسی کی محبت کے لئے گنجائش نہ رہے۔

مَا جَعَلَ اللّٰہُ لِرَجُلٍ مِّن قَلْبَیْنِ فِی جَوْفِہٖ — اللہ نے کسی شخص کے سینہ میں دو دل نہیں رکھے ہیں۔

قلب میں جس قدر غیر اللہ کی محبت آتی ہے اسی قدر وہ اللہ کی محبت سے خالی ہو جاتا ہے، جیسے برتن میں جب کوئی دوسری شئی داخل کی جاتی ہے تو اسی قدر وہ پہلی چیز سے خالی ہو جاتا ہے۔ اور کمال خضوع اور غایت اطاعت کے یہ معنی ہیں کہ اپنی تمام خواہشوں اور ارادوں کو اسکی رضا میں فنا کر دے۔

اِیَّاکَ جو نَعۡبُدُ کا مفعول ہے ، اس کی تقدیم حصر کے لیے ہے ، یعنی خاص تیری ہی بندگی کرتے ہیں کسی اور کی نہیں - نیز اس تقدیم میں یہ اشارہ ہے کہ عبادت کرنے والے کی نظر صرف معبود حقیقی اور خاص اس ذوالجلال والاکرام پر ہونی چاہیئے - اپنی عبادت پر نہ ہو - سادات صوفیہ اور ارباب طریقت کے نزدیک اصل عبادت وہی ہے جو محض اُس ذوالجلال والاکرام کے لیے ہو - کسی رغبت یا رہبت کی بنا پر نہ ہو - عبادت سے فقط اس کی رضا اور خوشنودی مقصود ومطلوب ہے ؎

خلاف طریقت بود کاولیا　　　　تمنا کنند از خدا جز خدا

گراز دوست چشمت براحسان اوست　　　　تو در بند خویشی نہ در بند دوست

اَعۡبُدُ (میں بندگی کرتا ہوں) کے بجائے نَعۡبُدُ - (ہم سب بندگی کرتے ہیں) لانے میں التزام جماعت کی طرف اشارہ ہے - نیز یہ بھی کہ اگر نفس کو اپنی اس عبادت پر ، جو کہ محض اُسی کی توفیق اور اعانت سے کی ہے کسی قسم کا عجب پیدا ہو تو اس کے لیے تنبیہ ہے کہ بندگی کرنے والا صرف میں ہی نہیں ہوں ، بلکہ بیشمار بندگی کرنے والوں میں سے ایک میں بھی ہوں -

(۲) چونکہ ابتداء سورت میں حمد وثنا تھی ، اس لیے اس کا ذکر غائبانہ انداز میں کیا گیا کیونکہ محبوب کی یاد اور اس کا تذکرہ غائبانہ ہی ہوکرتا ہے اور غیاب ہی میں یاد کرنا اخلاص کی علامت ہے - بخلاف اس کے عبادت کا حاصل چونکہ خدمت اور تعظیم ہے اور وہ حضوری ہی میں زیادہ مکمل ہوتی ہے ، اس لیے حمد اور ثنا کے غائبانہ طرز کلام کو چھوڑ کر اِیَّاکَ نَعۡبُدُ الخ میں مخاطبانہ اور حاضرانہ طرز کلام اختیار کیا گیا -

اِیَّاکَ نَعۡبُدُ میں فرقہ جبریہ کے رد کی طرف بھی اشارہ ہے - جبریہ بندے کو جماد کی طرح مجبور محض بتلاتے ہیں اِیَّاکَ نَعۡبُدُ سے اس کا رد ہوجاتا ہے کیونکہ عبادت کے معنی اختیاری تذلل کے ہیں -

اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ میں فرقہ معتزلہ کے رد کی طرف اشارہ ہے ارباب اعتزال بندے کو اپنے افعال کا خالق اور فاعل مستقل قرار دیتے ہیں - اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ سے اس کا رد ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اگرچہ عبادت اور بندگی

اپنے اختیار سے کرتا ہے۔ جماد کی طرح مجبور محض اور عاری من الاختیار نہیں، مگر ایسا فاعل مستقل بھی نہیں کہ اس کی اعانت سے مستغنی ہو جائے۔ فاعل مختار ضرور ہے مگر اپنے اس خداداد اختیار میں مختار نہیں ہر لمحہ اور ہر لحظہ اسکی اعانت اور امداد کا محتاج ہے۔ فافہم ذٰلک فانہ دقیق وسیأتی تفصیل ذلک انشاء اللہ تعالیٰ۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ

ہم کو راہ راست کی طرف ہدایت فرما

(۱) ہدایت کے معنی لطف اور مہربانی کے ساتھ رہنمائی کرنے کے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس لفظ کا استعمال ہمیشہ خیر ہی کے موقع پر ہوتا ہے۔

(۲) صراط اس راستہ کو کہتے ہیں جو مستقیم (یعنی سیدھا) ، اور موصل الی المقصود، اور قریب اور وسیع ہو، اور مقصود تک پہنچانے کے لیے مخصوص اور معین ہو۔ یعنی مقصود تک پہونچنے کا اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ ہو۔ جب تک یہ صفات خمسہ نہ پائی جائیں اس وقت تک صراط کا اطلاق نہ ہوگا اور صراط کی صفت میں جو لفظ مستقیم کہا گیا، تو وہ اشارہ ہے اس طرف کہ وہ راستہ مقصود تک پہنچنے کا قریب ترین راستہ ہے، اس لئے کہ خطوط واصلہ بین النقطتین میں سب سے مختصر اور قریب ترین خط، خط مستقیم ہی ہوتا ہے کما برھن ذلک فی اقلیدس، اور سیدھا ہی راستہ مقصود تک پہونچاتا ہے اور اسی ایک راستہ کا تمام عالم کے ہر فرد کے لیے تا قیام قیامت کافی ووافی ہونا اس کے وسیع ہونے کی دلیل ہے، اور خدا تک پہونچنے کے لیے یہی ایک راستہ ہے اس کے سوا اور کوئی راہ نہیں۔ کما قال تعالیٰ:۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ
اور یہ کہ یہ میرا سیدھا راستہ ہے، لہٰذا تم اس پر چلو اور دوسرے رستوں پر نہ چلو کہ وہ تم کو اس کے راستہ سے بھٹکا کر پراگندہ کر دیں گے۔

صراط کو اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی طرف مضاف کرنے میں اسی طرف اشارہ ہے کہ مقصود تک پہونچانے والا صرف یہی ایک راستہ ہے، جن جن پر اللہ کا انعام ہوا ہے وہ سب اسی راستہ پر چلے ہیں

اور اہل ضلال کے راستوں سے بالکل مغایر ہے عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس اور دیگر حضرات صحابہ نے صراط مستقیم کی تفسیر دین اسلام سے کی ہے اور یہی بعض روایات مرفوعہ صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے۔ جابر بن عبداللہ سے منقول ہے کہ صراط مستقیم سے اسلام مراد ہے جو کہ ما بین السماء والارض سے بدرجہا زائد وسیع ہے۔ محمد بن الحنفیہ فرماتے ہیں کہ صراط مستقیم سے مراد اللہ کا دین ہے جس کے سوا اور کوئی دین مقبول نہیں۔ (ابن کثیر) کما قال تعالیٰ:- وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ۔

اس آیت میں صراط کو الذین انعمت علیہم کی طرف اس لیے مضاف فرمایا کہ وہی لوگ اس پر چلنے والے ہیں جن پر اللہ کا انعام ہوا ہے اور آیت وَأَنَّ هَٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا، اور آیت وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ صِرَاطِ اللَّهِ میں صراط کو اللہ کی طرف اس لیے مضاف کیا گیا کہ صراط مستقیم اسی کا قائم کیا ہوا راستہ ہے۔

چونکہ ہدایت اور استقامت کے مراتب نہایت مختلف اور متفاوت ہیں، کوئی مرتبہ ہدایت اور استقامت کا ایسا نہیں کہ اُس سے اعلیٰ اور افضل مرتبہ متصور نہ ہو سکتا ہو، اور صراط مستقیم یعنی سیدھا راستہ اگرچہ ایک ہی ہے لیکن قرب اور بعد کے اعتبار سے اس میں بھی تفاوت ہو سکتا ہے اس لئے طلب ہدایت پر ہر شخص مامور ہے۔ طالب کو اگر ہدایت و استقامت کے بعض مراتب حاصل بھی ہوں تب بھی وہ اس سے اعلیٰ اور بہتر مراتب سے کسی طرح مستغنی نہیں ہو سکتا ؂

اے برادر بے نہایت درگہیست　　　　ہر چہ بروی میرسی بروے مائستیت

علاوہ بریں ہدایت پر قائم اور ثابت رہنے کے لیے ہر لمحہ اور ہر لحظہ الٰہی کی اعانت اور توفیق کی حاجت ہے جیسا کہ یا ایھا الذین آمنوا (اے ایمان والو ایمان لاؤ) میں ایمان والوں کو پھر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے اِس سے اسلام پر ثابت اور مستمر رہنا مقصود ہے جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام نے وصیت فرمائی تھی:-

يَا بَنِيَّ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ　　　　اے میرے بچو! اللہ نے تمہارے لیے اس دین کو پسند فرمایا ہے

اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ — لہذا تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔

اور اسی وجہ سے عباد مومنین کو اس دعا کی تلقین کی گئی :۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۔

اے ہمارے پروردگار! ہم کو ہدایت دینے کے بعد پھر ہمارے دلوں کو کجروی کی طرف مائل نہ ہونے دینا اور ہم کو اپنی طرف سے رحمت عطا کر کہ تو ہی عطا کرنے والا ہے۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ

ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا ہے، نہ کہ ان کا جن پر

وَلَا الضَّآلِّيْنَ

غضب ہوا ہے، اور نہ ان کا جو گمراہ ہیں

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سے ملائکہ اور انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین مراد ہیں جن کو حق تعالیٰ نے اپنی طاعت اور عبادت کی نعمت سے سرفراز فرمایا (ابن کثیر) اہل انعام کی کسی خاص نوع اور خاص قسم کو نہ ذکر کرنا بلکہ مطلق اہل انعام کے راستہ کی طرف ہدایت چاہنا۔ ایسی جامع دعا ہے کہ دنیا اور آخرت کی ہر قسم کی خیر اور فلاح کو شامل ہے۔ اس دعا کے معنی یہ ہیں کہ اے اللہ ہم کو اس راستہ کی طرف رہنمائی فرما جس پر تیرے تمام انعام پانے والے بندے گزرے ہیں۔ بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ وہ الطاف و کرم اور وہ آلاء و نعیم جو تو نے اپنے تمام انعام لینے والے بندوں پر متفرقاً نازل فرمائے۔ وہ ہم پر مجتمعاً نازل فرما۔

نیز لفظ صراط کو الذین انعمت علیہم کی طرف مضاف کرنے میں سالکین راہ حق اور رہروان منزل آخرت کے لیے ایک عظیم الشان تسلیہ ہے، کہ وہ سفر اور راستہ کی تنہائی سے ہرگز نہ ڈریں۔ نبیین اور صدیقین اور شہداء اور صالحین اُن کے رفیق سفر ہیں وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا۔

نیز مقام سؤال میں منعم کے انعامات و احسانات کا تذکرہ۔ اجابت اور قبول میں خاص اثر رکھتا ہے۔ اسی طرح

سوال ہدایت کے وقت حق جل وعلا کے انعام عام کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اے رب العالمین اور اے ارحم الراحمین تو نے اپنی رحمت واسعہ سے بہت سے بندوں پر ہدایت کا انعام فرمایا ہم کو بھی اس نعمت عظمٰی سے سرفراز اور اس پر استقامت نصیب فرما اور ہم گنہگاروں کو بھی اپنے لطف عمیم سے اہل انعام کے زمرہ میں داخل فرما۔ آمین۔

مغضوب علیہم سے وہ فریق مراد ہے جو دیدہ و دانستہ راہ راست کو چھوڑ دے اور علم صحیح کے باوجود ہوائے نفس کی پیروی میں غلط راستہ اختیار کرے۔ اس نوع کے کامل ترین افراد یہود بے بہبود ہیں کہ باوجود توراۃ کے عالم ہونے کے کتمان حق اور تکبر اور اتباع ہویٰ جیسے امراض میں مبتلا رہے۔ ....

.... انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے ہمیشہ معاندانہ رویہ رکھا، جان بوجھ کر قتل انبیاء اللہ کے مرتکب ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر ابد تک ذلت و مسکنت کی مہر لگا دی گئی غضب اور لعنت کا طوق ان کی گردن میں ڈال دیا گیا۔ من لعنہ اللہ وغضب علیہ۔

ضالین سے وہ گروہ مراد ہے جو سواء السبیل سے بھٹک کر غلط راستہ پر جا پڑا۔ اس نوع کے کامل ترین افراد نصاریٰ ہیں۔ کما قال تعالیٰ

وَأَضَلُّوا كَثِيرًا وَضَلُّوا عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ — بہتوں کو گمراہ کیا اور خود سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔

یہود اور نصاریٰ کے کامل ترین افراد ہونے ہی کی وجہ سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مغضوب علیہم کی تفسیر یہود سے اور ضالین کی تفسیر نصاریٰ سے فرمائی۔ اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ مغضوب علیہم اور ضالین کے مصداق صرف یہود اور نصاریٰ ہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان دو قسموں کے تحت میں ہر قسم کے گمراہ اور کافر اور فاسق و فاجر عاصی اور مبتدع علیٰ اختلاف المراتب داخل ہیں۔

سلف صالحین یہ فرمایا کرتے تھے کہ اس امت کے علماء میں سے جو بگڑا وہ یہود کے مشابہ ہوا، اس لیے کہ وہ اپنی اغراض کی وجہ سے کلمات الٰہیہ کی تحریف، اور کتمان ما انزل اللہ، اور تلبیس الحق بالباطل۔ اور اہل علم و فضل کے حسد میں گرفتار ہوا، جو کہ یہود کے اخلاق ہیں۔ اور اس امت کے عباد و زہاد میں سے جو بگڑا وہ نصاریٰ کے مشابہ

ہوا اس لیے کہ اس نے اپنی عبادت میں بجائے شریعت غراء او سنت بیضا کے ہوائے نفس کا اتباع کیا اور نصاریٰ کی طرح تعظیم مشائخ میں اس درجہ غلو کیا کہ اعتقاداً نہ سہی عملاً تو ضرور ان کو رب اور ان کی قبور کو مساجد بنا لیا۔

بعض مرتبہ چونکہ نعمت ہی علم و عمل کے فساد کا باعث ہوتی ہے، اکثر عیش و تنعم ہی میں پڑ کر انسان خدا کو بھی بھول جاتا ہے، احکام الٰہی کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔ اس لیے اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کے بعد غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کا اضافہ مناسب ہوا کہ اے رب العالمین اپنی نعمتوں پر حمد اور شکر کی توفیق عطا فرما۔ خدانخواستہ ایسا نہ ہو کہ تیرے انعام کے غرور اور تکبر میں مبتلا ہو کر سیدھے راستہ سے بہک جائیں اور تیری لعنت اور غضب کے مستحق بنیں۔

آیت موصوفہ میں صرف انعام کو اپنی جانب منسوب فرمایا غضب اور ضلال کو اپنی جانب منسوب نہیں فرمایا اس میں ایک لطیف اشارہ ہے۔ وہ یہ کہ انعام محض اس کا فضل ہے۔ بلا کسی استحقاق کے بندوں پر مبذول فرماتا ہے۔ مگر غضب ابتداءً نازل نہیں فرماتا بلکہ ان کی نافرمانی اور دیدہ و دانستہ عدول حکمی کے بعد۔ اور علیٰ ہذا گمراہ جب ہوتے ہیں تو صراط مستقیم کو چھوڑ کر غلط راہ اختیار کر لیتے ہیں۔ نیز ادب الٰہی کا اقتضاء یہ ہے کہ جب افعال احسان و رحمت کا ذکر ہو تو صراحۃً اللہ جل جلالہٗ کی طرف اس کی اسناد ہونی چاہیئے، اور جب افعال جزاء اور عقوبت کا ذکر ہو تو پھر فاعل کا حذف اور فعل کا مبنی للمفعول لانا مناسب ہے، مثلاً ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔

اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ۔

وہ جس نے مجھے پیدا کیا پھر وہی مجھے ہدایت بخشتا ہے اور وہ جو مجھ کو کھلاتا ہے اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفا بخشتا ہے۔

خلق اور ہدایت اور اطعام اور اسقاء اور شفاء ان تمام افعال کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب فرمایا مگر مرض کو شئے مکروہ ہونے کی وجہ سے ادباً اپنی جانب منسوب کیا۔ اور یہ کہا:۔

وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ

جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ مجھے شفا بخشتا ہے۔

یہ نہیں کہا کہ :-

وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۔ اور جب وہ مجھے بیمار ڈالتا ہے تو وہی مجھے شفا بخشتا ہے

اسی طرح مؤمنین جن نے وَاَنَّا لَا نَدْرِيْۤ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ میں ارادہ شر کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کیا اور یہ نہیں کہا کہ اَرَادَهٗ رَبُّهُمْ مگر جب اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا کہا تو ارادہ رشد کو رب العزت کی جانب منسوب کیا ۔

علیٰ ہذا خضر علیہ السلام نے فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا (میں نے ارادہ کیا کہ کشتی کو عیب دار کر دوں) میں عیب اور ارادہ عیب دونوں کو اپنی جانب منسوب کیا مگر جب یہ کہا کہ :-

فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَاۤ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۔ پھر تیرے رب نے ارادہ کیا کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچیں اور اپنے رب کی رحمت سے اپنے خزانہ کو نکالیں ۔

تو ارادہ رحمت کو رب العالمین کی جانب منسوب کیا اور وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ (میں نے اس کو اپنی طرف سے نہیں کیا) کہہ کر اس کو اور مؤکد کر دیا اور اسی طرح اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ اور اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ میں اس خاص احلال کو چونکہ اللہ جل جلالہ کی طرف منسوب کرنا خلاف ادب تھا اس لیے دونوں جگہ اُحِلَّ کو مبنی للمفعول ذکر کیا گیا اور ۔ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا میں ادب مانع نہ تھا اس لیے اس احلال اور تحریم کی صراحتہً اللہ کی طرف اسناد کی گئی ۔

نیز منعم حقیقی صرف وہی تبارک وتعالیٰ ہے ۔ کما قال تعالیٰ

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۔ تمہارے پاس جو نعمت بھی ہے خدا کی طرف سے ہے

اس لیے انعام کو اللہ کی طرف منسوب کیا گیا ۔ مگر غضب خدا کے ساتھ مخصوص نہیں ۔ ملائکہ اور انبیاء اور عباد صالحین کی طرف سے بھی خدا کے نافرمان اور سرکش بندوں پر ہو سکتا ہے اس لیے اس کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کیا گیا ۔

نیز مَغضُوبِ عَلَیہِم کے فاعل کا حذف اہل غضب کی تحقیر اور تذلیل کی طرف مشیر ہے اور فاعل انعام کی تصریح اہل انعام کی تشریف وتکریم کی طرف اشارہ کرتی ہے مثلاً کسی شخص کی نسبت یہ کہنا۔ ھٰذا الذی اکرمہ السلطان وخلع علیہ (یہ وہ شخص ہے جس کو بادشاہ نے عزت دی ہے اور اسے خلعت سے سرفراز فرمایا ہے) بہ نسبت ھٰذَا الَّذِیْ اُکْرِمَ وَخُلِعَ عَلَیْہِ (یہ وہ شخص ہے جس کو عزت دی گئی اور خلعت سے سرفراز کیا گیا) کے بدرجہا بلیغ ہے، اور ذکر فاعل کی وجہ سے پہلا کلام جس قدر ممدوح کی مدح وثنا اور تشریف وتکریم پر دلالت کرتا ہے اور دوسرا کلام اس دلالت میں اُس کے پاسنگ بھی نہیں۔ نیز حذفِ فاعل کچھ اعراض اور ترکِ التفات پر دلالت کرتا ہے جو اہل غضب کے مناسب ہے اہل انعام کے مناسب نہیں، اس لیے انعام کا فاعل ذکر کیا گیا اور غضب کا فاعل حذف کیا گیا۔ اور چونکہ انعام کی ضد غضب ہے، ضلال انعام کا مقابل نہیں بلکہ رشد اور ہدایت کا مقابل ہے، اس لیے اہل انعام یعنی اَلَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ کے بعد متصلاً ہی اہل غضب یعنی غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ کا ذکر فرمایا اور اہل ضلال کو بعد میں ذکر کیا کیونکہ ایک ضد کے بعد دوسری ضد کا ذکر کلام میں ایک خاص شان اور خاص تناسب پیدا کردیتا ہے اور اہل غضب کی تقدیم کی ایک یہ بھی وجہ ہے کہ یہود بہ نسبت نصاریٰ کے اسلام سے زیادہ دور ہیں۔ اس لیے کہ نصاریٰ نے صرف ایک نبی یعنی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی اور یہود نے دو پیغمبروں کی یعنی مسیح بن مریم اور محمد مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی۔ حق تعالیٰ شانہ نے غیر المغضوب علیہم کو لفظ غیر کے ساتھ ذکر فرمایا اور لفظ لا کے ساتھ لا المغضوب علیہم نہیں فرمایا اس لیے کہ حرف لا فقط ماقبل کی نفی کے لیے آتا ہے اس صورت میں کلام کے یہ معنی ہوتے کہ اے اللہ ہم کو اہل انعام کا راستہ بتلا نہ کہ اہل غضب کا۔ اور لفظ غیر ماقبل کی نفی اور مغایرت دونوں پر دلالت کرتا ہے فرق اتنا ہے کہ مغایرت پر صراحۃً اور نفی ماقبل پر ضمناً اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ اے اللہ ہم کو اہل انعام کا راستہ بتلا جن کا راستہ اہل غضب اور اہل ضلال کے راستہ سے بالکل مغایر اور مباین ہے یعنی خود اہل انعام اور ان کا راستہ غضب اور ضلال کے شائبہ سے بالکلیہ پاک ہے اہل فہم غور کریں کہ یہ معنی بہ نسبت پہلے معنی کے کس قدر لطیف ہیں اور کیا یہ لطافت بجائے لفظ غیر کے حرف لا لانے

سے حاصل ہو سکتی ہے ؟ ہرگز نہیں۔

نیز لفظ غیر کے لانے میں ایک یہ بھی اشارہ ہے کہ یہود اور نصاریٰ کا یہ زعم کہ ہم ہی اہل انعام ہیں جیسے وہ کہتے تھے کہ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ، غلط ہے بلکہ اہل انعام ان کے سوا دوسرے ہیں۔ کما قال تعالیٰ

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔

آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا۔

اور وَلَا الضَّآلِّيْنَ میں حرف عاطف یعنی واو کے ہوتے ہوئے حرف لا کا اس لیے اضافہ فرمایا کہ اہل انعام کے راستہ کا اہل غضب اور اہل ضلال کے راستہ سے فرداً فرداً اور علیحدہ علیحدہ مغایر ہونا معلوم ہو جائے۔ وَلَا الضَّآلِّيْنَ سے اگر حرف لا کو حذف کر کے غیر المغضوب علیہم والضالین کہا جاتا تو مجموعۂ فریقین کے راستہ سے اہل انعام کے راستہ کا مغایر ہونا مفہوم ہوگا۔ اہل انعام کے راستہ کا ہر ایک سے علیحدہ علیحدہ مغایر ہونا معلوم نہ ہوگا اور ظاہر ہے کہ مجموع من حیث المجموع کی مغایرت ہر واحد کی مغایرت کو مستلزم نہیں۔ ہاں ہر واحد کی مغایرت مجموع من حیث المجموع کی مغایرت کو بالاولویت مستلزم ہے۔ فافھم۔

صلوٰۃ مسلمین اور صلوٰۃ نصاریٰ کا تقابل :-

کلام الٰہی کے دقائق و اسرار کا تو کون احاطہ کر سکتا ہے بڑے سے بڑے فہیم اور ذکی اور صاحب فہم ثاقب کی بھی وہاں رسائی نہیں۔ یہ مختصر سورت یعنی سورۂ فاتحہ جس کے معارف و لطائف کا ایک نمونہ ہدیۂ ناظرین کیا گیا ہے اس کے وہ اسرار و معارف جو اللہ رب العزت کے علم میں ہیں وہ تو در کنار، علماء اسلام اور حضرات مفسرین نے جو اس مختصر سورت کے حقایق و معارف بیان فرمائے ہیں ہم انہیں کے استیعاب اور استقصار سے عاجز اور درماندہ ہیں، جس کی تصدیق علماء اسلام کی تفاسیر سے بخوبی ہو سکتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ،، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات پاک کی کہ جس کے ہاتھ میں میری جان ہے سورۂ فاتحہ

جیسی نہ توریت میں اتاری گئی اور نہ زبور میں اور نہ انجیل میں"، (اخرجہ الترمذی وصححہ) اسی وجہ سے ہر نماز میں اس صورت کا پڑھنا لازم قرار دیا گیا۔

اسوقت ہم انجیل کی وہ عبارت ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں جس کو نصاریٰ نمازوں میں پڑھتے ہیں تاکہ وہ لوگ موازنہ اور مقابلہ سے اہل اسلام کے ایمان اور ایقان میں اضافہ ہو اور نصاریٰ کے لیے اگر وہ خدا سے ڈریں اور غور اور فکر سے کام لیں تو ان کے لئے موجب ہدایت ہو۔

انجیل متی باب ششم آیت نہم میں ہے کہ اس طرح نماز پڑھا کرو:۔

أَبُوْنَا الَّذِيْ فِي السَّمٰوٰتِ لِيَتَقَدَّسِ اِسْمُكَ لِيَأْتِ مَلَكُوْتُكَ لِتَكُنْ مَشِيْئَتُكَ

اے ہمارے باپ تو جو آسمان پر ہے تیرا نام پاک ہو تیری بادشاہت آئے تیری مشیت جیسے

كَمَا فِي السَّمَاءِ عَلَى الْأَرْضِ خُبْزَنَا كَفَافَنَا أَعْطِنَا الْيَوْمَ ـ وَاغْفِرْ لَنَا

آسمانوں پر پوری ہوتی ہے ایسے ہی زمین پر بھی ہو ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے اور ہماری خطاؤں کو

خَطَايَانَا كَمَا نَغْفِرُ نَحْنُ لِمَنْ أَخْطَأَ إِلَيْنَا ـ وَلَا تُدْخِلْنَا فِي التَّجَارِبِ لٰكِنْ

معاف کر جیسا کہ ہم اپنے خطاکاروں کی خطائیں معاف کرتے ہیں اور ہم کو آزمائش میں نہ لا بلکہ برائی

نَجِّنَا مِنَ الشِّرِّيْرِ ـ آمِيْن ـ

سے بچا۔　　آمین۔ یعنی قبول فرما۔

ارباب فہم و بصیرت اگر سورۂ فاتحہ کے بعد اس عبارت پر ایک نظر ڈالیں تو ان کو بخوبی منکشف ہو جائے گا کہ اس عبارت کو سورۂ فاتحہ کے ساتھ وہ نسبت بھی نہیں جو ثریٰ (خاک) کو ثریا سے ہے۔ صیغۂ امر سے تقدیس اسم اور اتیان ملکوت کو طلب کرنا محض لاطائل اور تحصیل حاصل ہے۔ وہ ہمیشہ سے قدوس اور سلام اور ملیک مقتدر اور عزیز وحکیم ہے اس مالک الملکوت اور قدوس حکیم کی شان میں یہ لفظ کہنا کہ چاہیے کہ تیرا نام پاک ہو اور تیری بادشاہت آئے سراسر خلاف ادب ہے۔ اور علی ہذا یہ کہنا کہ لِتَكُنْ مَشِيْئَتُكَ كَمَا فِي السَّمَاءِ عَلَى الْأَرْضِ)

"چاہیئے کہ تیری مشیت جیسے آسمان میں ہے ویسے ہی زمین میں بھی ہو" یہ بھی سراسر خلاف ادب ہے کیا اُس کی مشیت سبع سموات اور سبع ارضین میں جاری اور ساری نہیں ؟ اور کیا کوئی ذرہ اُس کی قدرت اور مشیت سے مستثنیٰ ہے ؟ حاشا وکلا۔ بلیٰ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰہُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔

اور علی ہذا آج کی روٹی کے سوال کو ہدایت اور صراط مستقیم کے سوال سے جو دنیا اور آخرت کی صلاح اور فلاح اور سعادت دارین کو علیٰ وجہ الاتم شامل ہے، کیا نسبت ؟ اور پھر اُس غفور رحیم اور لیس کمثلہ شیٔ سے یہ سوال کرنا کہ ایسی مغفرت عطا فرما کہ جیسی ہم اپنے گنہگاروں اور خطاکاروں کی مغفرت کرتے ہیں، کھلی ہوئی سفاہت اور صریح گستاخی ہے۔ اُس کی کامل، عظیم اور وسیع و عمیم مغفرت کو اپنی ناقص اور محدود اور برائے نام مغفرت کے ساتھ تشبیہ دینا اور درپردہ اپنے خطاکاروں کو خدا کے خطاکاروں کے مماثل اور ضمناً اپنی نافرمانی کو خدا کی نافرمانی کے ہم پلہ قرار دینا کیا یہ کھلی ہوئی گستاخی نہیں۔ اُس رب العالمین اور اُس خلاق شان کے تمام آلاء و نعم میں سے صرف آج کی روٹی کا سوال کرنا اور اُس رب غفور اور ارحم الراحمین سے اپنی ناقص اور محدود مغفرت کے مماثل مغفرت طلب کرنا فقدانِ فہم و فراست کو خوب واضح کرتا ہے۔

حاملانِ قرآن

شیخ محمد افضل عمادی

(۴)

(از مولوی محمد عثمان صاحب عمادی بی ایس سی، علیگ)

مَا خُصِّصْتُ بِشَيْءٍ إِلَّا الْفَهْمَ فِي الْقُرْآنِ

(مجھے صرف یہ خاص نعمت حاصل ہوئی کہ میں کلام اللہ کو سمجھوں)

(حضرت علی رضی اللہ عنہ)

عذاب آخرت سے کیا فائدہ ہے؟ یہ مسئلہ رد و قبول و ایراد و اصرار کا موضوع بنا ہوا تھا کہ دوزخ میں عاصیوں کو مبتلائے عذاب جاوید رکھنے سے مصلحت کا کیا پہلو نکلتا ہے؟

فرمایا:۔

متاخرین فلاسفہ اسلام کی تحقیق و تنقیب کی بہترین جامع تالیف "اسفار اربعہ" ہے کہ ہمارے درس میں بھی داخل ہے۔ حکمائے ملت اسلامیہ نے اپنے مخصوص فلسفہ میں جہاں تک ترقی کی تھی یہ کتاب اس کے مراحل ارتقاء کی منزل ہے۔ آخوند ملا علی وامغانی کے اہتمام سے ۱۲۸۲ھ میں شائع ہوئی۔ فلسفۂ الہیات میں صاحب کتاب پر فوق تصوف غالب ہے۔ صفویوں کے عہد میں ایران سے تصوف کی بیخ کنی ہوگئی، کسی کو صوفی کہنا اس کو مطعون بنانا تھا، لیکن خدا کے نقارہ کی آواز کو کون روک سکتا ہے؟ زبان خلق نے ان کو صوفی مشہور کر دیا۔ ہنوز تین پشتیں گزرنے نہ پائی

بھتیں کہ اصفہان سے نکل کے اس شہر تک کے چرچے لکھنؤ میں ہونے لگے کہ وہ بھی ہندوستان کا اصفہان تھا۔ زوالِ دولت اودھ سے قبل طالب علمی کے لئے جب میں مقیم لکھنؤ تھا تو صاحب اسفار کے حفید سے اکثر ملاقات ہوا کرتی تھی۔ وہ بھی عالم تھے مگر اہلِ علم نہ تھے نسبت صوفیت سے ان کو شدید انکار تھا اور اس باب میں انھوں نے ایک عربی رسالہ بھی لکھا تھا جس کا ایک نسخہ مطبوعہ مجھے بھی دیا تھا۔ رسالہ کا موضوع مغالطات مبین و کیا تر حلقہ کے سہارے اتنا ہی لکھا کہ صاحب اسفار صوفی نہ تھے، شیعی اداء تھے، نہ کرفی تھے نہ شامی تھے۔

یہ ایک ضمنی بات تھی۔ اب اصل سوال پر نظر کرنے کی ضرورت ہے۔

اسفار کی چوتھی جلد کے اواخر میں ایک عنوان ہے "ذکر تنبیہی" اس ذیل میں اس آیہ کریمہ کی تحقیق کرتے ہیں:-

وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ — اس آگ سے بچو کہ آدمی اور پتھر اسکے ایندھن ہونگے۔

یہ تحقیق عارفان طریقت کی سند سے تمامتر مستند ہے قال بعض العرفاء سے اسکی ابتدا کی ہے جس سے شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اندلسی مراد ہیں کہ صاحب اسفار ان کے بہت ہی معتقد ہیں اور ان سے جابجا سند لیتے ہیں

عذاب بھی ایک علاج ہے

اسفار میں اسکی بسوط و شرح بحث موجود ہے اور جابجا اس پر کلام کیا ہے معتقدات فلسفیہ سے قطع نظر کرتے ہوئے ایک مقام کے خاص فقرے یہ ہیں:-

ان النار قد تتخذ دواءً لبعض الامراض و	بعض بیماریوں میں آگ سے علاج کرتے ہیں، ایسی بیماری
هو الداء الذي لا يتقى الا بالكي من النار	کی دوا آگ ہی ہے، اس بیماری سے بچنے کی بجز اس
لقوله تعالى "فتكوى بها جباههم وجنوبهم"	کے کوئی صورت نہیں کہ آگ سے داغ دیں، اللہ تعالیٰ
الآية، فقد جعل الله النار وقاية في	فرماتا ہے "آگ سے ان کی پیشانیوں اور پہلوؤں کو
هذا الموطن من داءٍ هو اشد من النار	داغ دیا جائے گا" اللہ تعالیٰ نے اس جگہ آگ کو
في حق المبتلى به داء الكبر من الكبائر	اس بیماری سے بچنے کا ذریعہ قرار دیا ہے جو اس مبتلا کے

فقد جعل الله لهم النار يوم القيامة دواءً كالكي بالنار فيدفع بدخولهم النار يوم القيامة داءً عظيماً اعظم من النار وهو غضب الله ولهذا يخرجون بعد ذلك من النار الى الجنة كما جعل الله في الحدود في الدنيا دية ووقاية من عذاب الآخرة۔

حق میں آگ سے کہیں زیادہ سخت ہے، کبائر گناہ سے بڑھ کے اور کون سی بیماری ہوسکتی ہے، ایسے بیماران معصیت کے لیے اللہ تعالیٰ نے وہ دوا تجویز کی ہے جو آگ سے داغنے کے مشابہ ہے، اس علاج کے ذریعہ سے ان کو آگ میں ڈال کر اس بڑی بیماری سے بچا لیا جو آگ سے بہت ہی بڑھی چڑھی ہے یہ بہت بڑی بیماری اللہ کے غضب کی تھی جس سے آتش دوزخ میں عذاب پانے والے بچ گئے، یہی وجہ ہے کہ اس عذاب کے بعد یہ لوگ دوزخ سے نکل کر جنت میں لائے جائیں گے، اسکی مثال دنیاوی معاملات میں حدود شرعی ہیں کہ اگرچہ ان حدود میں تعزیر و سزا ہوتی ہے مگر اس تعزیر کو برداشت کر لینے کے بعد عذاب آخرت سے نجات ہے۔

دوزخ کا وجود حقیقی | فرمایا:۔

ان جهنم ليست من حيث كونها دار العذاب لها وجود حقيقي بل منشأ وجودها الضلال والعصيان في النفوس حتى انه لو لم يكن معصية بني آدم لما خلق الله النار۔

دوزخ اپنی ہستی میں دراصل عذاب کا ایسا مقام نہیں کہ کوئی حقیقی وجود رکھتا ہو طبیعتوں میں گمراہی و نافرمانی کا موجود ہونا ہی منشائے وجود دوزخ ہے، حتیٰ کہ انسان میں اگر معصیت کی خاصیت نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ دوزخ کو پیدا ہی نہ کرتا۔

استعداد نفوس | فرمایا:۔

ان اهل العذاب هم الذين نفوسهم كانت مستعدة لدرجة من درجات الجنان ثم بطل استعدادهم بارتكاب المعاصي

اہل عذاب وہی ہیں جن کے نفس بہشت کا کوئی نہ کوئی درجہ حاصل کرنے کے لیے آمادہ تھے معصیت کے ارتکاب سے یہ استعداد جاتی رہی۔ اب ان کی حالت اس شخص کی سی

فحالهم کحال من انحرف عن الاعتدال اللائق به والصحة التی له بجسمه فیکون فی المرض حتی یرجع الی الاعتدال الذی کان له او بطل استعداده بالکلیة وانتقل مزاجه الی مزاج وافقه تلک الحالة التی کانت مخالفة لمزاجه الاول وکان مرضًا فی حقه فصار المرض صحة له والالم راحة له وانقلب العذاب عذوبة فی حقه لانقلاب جوهره الی جوهرٍ ادنیٰ

ہوگئی جس کا مزاج حد اعتدال سے منحرف ہوگیا ہو، یعنی جو اعتدال اور صحت اس کے لائق تھی وہ نہ رہی، ایسا شخص اسی وقت تک شدید الم میں مبتلا رہے گا جب تک کہ پھر وہی اعتدال مزاج اسکو حاصل نہ ہوجائے یا پھر یہ صورت ہو کہ اسکی استعداد بالکل ہی باطل ہوجائے اور اس کا مزاج منتقل ہوکر ایسا ہو جائے کہ اس حالت کے موافق اور پہلے مزاج کے مخالف ہو۔ پہلے مزاج کی بنا پر جو حالت تھی وہ اس کے حق میں بیماری کا حکم رکھتی تھی، اب دوسرے مزاج کی رو سے وہی بیماری صحت، وہی الم راحت، وہی عذاب عذوبت، اس کے حق میں بن گیا سبب یہ ہے کہ اس کے جوہر میں انقلاب آگیا اور اب وہ ایک ادنی درجہ کا جوہر ہو رہا۔

معذبین فی النار فرمایا:-

فکذلک حال من یدخل فی النار و یتعذب بها مدةً لاجل الاعمال السیئة فان بقی فی قلبه نور الایمان فیمنع ان ینغمس ظلمة المعاصی فی باطن قلبه ویحیط به السیئات فلا محالة یخرج من النار ویبرء من العذاب واما من اسود قلبه بالکلیة وغاص فی باطن قلبه ظلمة المعاصی لاجل الکفر فلا یخرج من النار ابدًا مخلدًا۔

یہی حال ان لوگوں کا ہے جو آگ میں داخل ہوں اور اپنے اعمال بد کے باعث ایک مدت تک آگ کے عذاب میں تڑپتے رہیں، ایسے شخص کے دل میں اگر نور ایمان باقی ہے تو نہ معصیت کی تاریکی اس کے قلب کے اندر گھر کرسکتی ہے اور نہ گناہ اس کو ہر طرف سے گھیر سکتے ہیں، ایسا شخص لامحالہ آگ سے نکالا جائے گا اور عذاب سے بچیگا، لیکن وہ شخص جس کا قلب بالکل تاریک ہوگیا ہو اور کفر کے باعث معصیت کی تاریکی نے اُس کے قلب کے اندر گھر بنا لیا ہو ایسا شخص ہمیشہ آگ ہی میں جلتا رہے گا اور کبھی اس عذاب سے رہائی نہ پائے گا۔

فرمایا:- حیف ہے کہ ان حالات میں بھی نفس کافر ایمان نہ لائے اور حق مطلق سے رجوع نہ کرے جو ادعونی (مجھ سے دعا کرو) کی دعوت دیتا ہے اور "استجب لکم" (میں تمہارے حق میں تمہاری دعا قبول کرلونگا) کا مژدہ بھی سُناتا ہے سہ

صبحے بنال راہ فلک بزبستہ اند! — ہر چند دیر آمدۂ در نبستہ اند!
حرمانِ توز ہمت کوتاہ بین تست — ہرگز درِ کریم بکافر نبستہ اند
سرمایۂ شناخت چراغیت دادہ اند — آوارہ چراغ ز صرصر نبستہ اند
بر تشنگان بہار تجلی برائے چیست — دریا کریم و ظرف ترا سر نبستہ اند

ربنا اھدنا الصراط المستقیم، صراط الذین انعمت علیھم، غیر المغضوب علیھم ولا الضالین، آمین،

شفاعت شفاعت کیا ہے اور کیوں اسکی ضرورت ہے؟ سلسلہ کلام دراز ہو رہا تھا اور حلقے تنگ سے تنگ تر ہوتے جاتے تھے۔

فرمایا:- شفاعت کا مادہ شفع ہے جس کے معنی زوج (جفت) کے ہیں، شفاعت کرنے والے کو شفیع اسی لیئے کہتے ہیں کہ صاحب حاجت کے ساتھ وہ بھی طلب حاجت میں شریک ہوجاتا ہے، اور مثنی کو بھی بعض حالتوں میں شفیع اور شفوع کہتے ہیں۔

فالشفاعة ضم غيرك الى جاهك و وسيلتك فهي على التحقيق اظهار لمنزلة الشفيع عند المشفع و ايصال منفعة الى المشفوع له

شفاعت کے معنی یہ ہیں کہ کسی دوسرے کو تم اپنی جاہ و مرتبہ کے حصول میں ساتھ ملالو اور اسکو وسیلہ بنالو تحقیق یہ ہے کہ شفاعت اصل میں شفاعت کرنے والے کی منزلت کا اس شخص کے سامنے ظاہر کرنا ہے جس کے پاس شفاعت کی جائے اسکے ساتھ ایک ضمنی مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ جس کی شفاعت کریں اسے کچھ نفع بھی ہو۔

علما نے شفاعت کو صرف خیر تک محدود رکھا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے شفاعت شر کی بھی تصریح کی ہے جس سے نمیمہ، غیبت، نقل کلام بغرض القائے عداوت مراد لیتے ہیں۔

مَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَكُنْ لَهُ نَصِيبٌ مِنْهَا وَمَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَكُنْ لَهُ كِفْلٌ مِنْهَا وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ مُقِيتًا

جس نے کوئی اچھی شفاعت کی تو اس شفاعت میں سے کچھ حصہ اس کا بھی ہوگا، اور جس نے کوئی بری شفاعت کی تو اس شفاعت کا کچھ بار اس پر بھی پڑے گا، اور اللہ ہر چیز پر مقتدر ہے۔

شفاعت سیئہ کی یہ بھی تاویل کی گئی ہے کہ "شفع کفرہ بقتال المومنین"، یعنی مومنین کے ساتھ جنگ کرنے میں کفر کا ساتھ دے۔ اس کی تائید ابو موسیٰ کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کے امام بخاری و امام مسلم دونوں ہی راوی ہیں:-

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم جالسا فجاء رجل يسأل فاقبل علينا بوجهه فقال اشفعوا تؤجروا ويقضي الله على لسان رسوله ما شاء

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے تھے کہ ایک شخص آکے سوال کرنے لگا۔ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہم لوگوں کی جانب رخ کر کے فرمایا: "شفاعت کرو"، یعنی کاربراری میں تم لوگ بھی اس کا ساتھ دو اور اسکی حاجت میں شریک ہو جاؤ، "تمہیں اس کا اجر ملے گا"، اللہ جو چاہتا ہے وہی اپنے پیغمبر کی زبان سے پورا کراتا ہے۔

اس حقیقت کو ذہن نشین رکھنے کے بعد شفاعت پر کیا اعتراض رہ گیا؟ جو لوگ اس کو ایک طرح کی سخن سازی سمجھتے ہیں کہ کسی کے کہنے یا زور ڈالنے سے اللہ تعالیٰ انسان کی بدکرداریوں سے چشم پوشی کرتے ہوئے اس کو بخش دے گا۔ ایسے نادان یقیناً کلام عرب سے انجان اور مفہوم شفاعت سے قطعاً بے خبر ہیں ؎

رحیل عمر روان است و محشرے در پیش
بیا و روے بسوئے شفیع محشر کن!

رسائل و مسائل

ایمان بالرسالۃ

جمادی الاولیٰ کے رسالہ ترجمان القرآن کے صفحہ ۵۵ پر ایمان بالرسالت کے متعلق عالمانہ تبصرہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ میرے ناقص خیال میں ایک دو پہلو ابھی حل طلب ہیں جو مختصراً معروض ذیل ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو جو ایسے مضامین پر ترجمان القرآن میں بصورت مذاکرۂ علمیہ اظہار خیال ہوتا رہے۔

(۱) آپ فرماتے ہیں کہ "انسان کی فطرت میں خدا کی معرفت اور اس کے لیے بندگی کے خلوص کی استعداد موجود ہے .... لیکن اس فطری استعداد کے قوت سے فعل میں آنے کے لیے چند شرائط ہیں اور بادنیٰ تامل یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ شرائط ہر شخص میں پوری نہیں ہوتیں" اس کے بعد ان شرائط کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ فرمودہ الٰہی لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کے مطابق ہر شخص اپنی وسعت علم اور فکر تک مکلف ہے جیسا کہ شروع سوال میں مذکور ہے۔ اگر تربیت، ماحول اور استعداد ذاتی تکمیل شرائط میں مانع ہیں تو اس کمی کی ذمہ داری اس متجسس پر کیوں عاید ہو؟ انتخاب طریقت میں اس نے اپنی لیاقت کے مطابق تفکر اور تعقل سے کام لیا اور اسی حد تک وہ مکلف تھا۔ اسکو مورد الزام و عذاب کرنا بظاہر تکلیف مالایطاق ہے۔

(ب) جناب فرماتے ہیں کہ "قرآن مجید کوئی مسلسل تصنیف نہیں جس میں ترتیب کے ساتھ ہر مسئلے کو ایک ایک جگہ مفصل بیان کیا گیا ہو۔ بلکہ یہ مجموعہ ہے ان آیات کا جو ۲۳ سال کی طویل مدت میں موقع اور ضرورت کے لحاظ سے نجماً نجماً نازل ہوتی رہی ہیں"، مگر پھر بھی ارشاد ہوتا ہے کہ سورۂ آل عمران کو چھٹے رکوع سے لے کر بارہویں رکوع تک مسلسل پڑھا جائے تاکہ تناقض کا شائبہ تک نہ رہے۔ سوال بھیجنے سے پہلے بھی پڑھا تھا اور دو بارہ بھی ان سب آیات کو پڑھا ہے مگر مشکل رفع نہیں ہوتی۔ اہل کتاب کے جھگڑوں، عناد، شرک، مکر وغیرہ کو دیکھ کر ایک معتدل روش کی طرف دعوت دی گئی تھی کہ "تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ الخ"۔ ان کلمات اور اس دعوت کا کیا مفہوم اور مقصد تھا؟ بظاہر تو یہی ہے کہ تم اگر اپنی سچی تعلیم پر عمل کرو گے اور شرک چھوڑ دو گے تو دعوت الی اللہ کے مشترک کام میں تم اور ہم یکساں ہوں گے۔ دل نہیں مانتا کہ یہ الفاظ یونہی رسمی طور پر دفع الوقتی یا رفع الزام کے لیے کہے گئے اور کہ فی الحقیقت اشتراک فی العمل و دعوت مقصود نہ تھا۔

(ج) سوال لکھتے وقت فی الذہن اہل کتاب ہی تھے اور آیات مرقومہ اسی لیے استشہاداً پیش کی گئی تھیں۔ جہاں کہیں اہل کتاب کے اس گروہ کی تعریف کی گئی ہے جو دیانت دار تھے۔ خدا ترس تھے۔ امین تھے شب گزار تھے بعض مفسرین نے اسکی وہی تفسیر کی ہے جس کی طرف آپ گئے ہیں کہ یہ وہ گروہ ہے جو مسلمان ہو چکا تھا۔ جیسے کہ عبداللہ بن سلام ثعلبہ انصاری جبران وغیرہم۔ مگر افسوس کہ اس سے تسلی نہیں ہوتی اور نہ ہی الفاظ قرآن اس کے حامی ہیں مثلاً آیت وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْکِتٰبِ لَکَانَ خَیْرًا لَّهُمْ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَکْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ کے ترجمہ میں آپ یہ فرماتے ہیں کہ "ان میں سے تھوڑے ایمان لائے اور اکثر نافرمان ہیں"، مومنون اور فاسقون دونوں ساتھ ساتھ مذکور ہیں

اور دونوں اسم فاعل کے صیغے ہیں ان میں سے ایک کے معنی ماضی کے لیئے اور دوسرے کے حال کے
اور پھر الفاظ منہم اور اکثرہم کے مفہوم کو متعین نہ کرنا تسلی بخش نہیں کما لا یخفی علی
المتامل - مگر دوسری آیت واضح ترین ہے جس میں ایسی تاویل کی گنجائش ہی نہیں اور
جس کا ترجمہ جناب نے نہیں فرمایا یعنی لَيْسُوا سَوَاءً مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ
قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ - يُؤْمِنُونَ
بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ
فِي الْخَيْرَاتِ وَأُولَٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ - وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُكْفَرُوهُ
وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ - (سب کے سب برابر نہیں اہل کتاب میں سے ایسے لوگ بھی
ہیں جو اللہ کی آیتیں راتوں کھڑے پڑھتے رہتے ہیں اور سجدے کرتے ہیں اللہ پر ایمان
رکھتے ہیں اور روز آخرت پر، نیک کاموں کا حکم کرتے ہیں اور برے کاموں سے منع کرتے
ہیں اور نیک کاموں میں جلدی کرتے ہیں اور یہی لوگ صالحین میں سے ہیں وہ کسی طرح
کی بھی نیکی کریں گے اسکی ہرگز ناقدری نہ ہوگی اور اللہ متقین کو خوب جانتا ہے) اسکی
تائید قرآن شریف کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے، جس میں نصاریٰ کی تعریف کی ہے کہ
ان میں دیندار طبقہ ہے اور وہ متکبر نہیں ہیں۔ اگر آیات مذکورہ سے مراد وہی اہل
جو جناب لے رہے ہیں تو فصاحت اور بلاغت قرآنی کو مدنظر رکھتے ہوئے، الفاظ مختلف ہوتے

(د) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَآمِنُوا بِرَسُولِهِ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ
رَحْمَتِهِ کے متعلق جناب فرماتے ہیں کہ "اس میں ان تمام لوگوں کو جو پچھلے انبیاء پر ایمان لا چکے
ہیں دو چیزوں کی دعوت دی گئی ہے ایک یہ کہ خدا سے ڈریں اور تقوےٰ اختیار کریں۔
دوسرے یہ کہ خدا کے رسول یعنی محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں پھر فرمایا کہ اگر تم

دونوں باتیں اختیار کروگے تو تم کو خدا کی رحمت سے دو حصے ملیں گے یعنی ایک حصہ انبیاء سابقین پر ایمان اور تقویٰ کے اجر میں اور دوسرا حصہ ایمان بر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اجر میں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ تقویٰ اور پرہیزگاری کے ساتھ پچھلے انبیاء پر ایمان رکھتے ہیں اور انکی دی ہوئی تعلیم پر ٹھیک ٹھیک عامل ہیں ان کو بھی خدا کی رحمت کا ایک حصہ ملیگا، اس کی تائید دوسری آیات سے بھی ہوتی ہے مثلاً ”وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ“، مگر ان سب آیات کو ملا کر جو نتیجہ آپ نے آخر مضمون میں نکالا ہے تعجب انگیز ہے یعنی ”ان کو اللہ کی رحمت کا صرف آدھا حصہ ملیگا کہ ان پر عذاب میں تخفیف ہوگی“، تیلی بھی کیا اور دو کھا کھایا۔

کم علمی کی وجہ سے یہ شکوک سوجھے ہیں اگر جناب و دیگر علمائے کرام مزید توجہ فرما کر ان کو رفع کریں گے تو انشاء اللہ عند الناس مشکور اور عند اللہ ماجور ہوں گے۔ ایک مسلمان

ترجمان القرآن - آپنے جو اعتراضات پیش فرمائے ہیں ان کے جوابات مختصراً درج ذیل ہیں :-

(۱) آپ کا استدلال اگر صحیح مان لیا جائے تو اس سے نہ صرف منکر رسالت کو برسر حق تسلیم کرنا لازم آئے گا بلکہ ہر شخص کے مسلک کو اسکی حد تک صحیح مان لینا لازم آجائے گا خواہ وہ مشرک ہو، یا دہریہ یا کوئی اور۔ کیونکہ جب ہر شخص اپنی وسعت علم و فکر کی حد تک مکلف ہے، اور تلاش حق میں غلطی یا کوتاہی کی ذمہ داری اس پر کچھ نہیں ہے، تو جس طرح وہ موحد مورد الزام و مستحق عذاب نہیں ہے جو غور و فکر کے باوجود رسالت میں نیک نیتی کے ساتھ شک رکھتا ہے، اسی طرح وہ مشرک بھی کسی عقوبت کا مستحق نہ ہونا چاہیئے جو ”نیک نیتی“ کے ساتھ کسی پتھر یا درخت یا جانور کو خدا سمجھتا ہے اور وہ دہریہ بھی کسی سزا کا مستوجب نہ ہونا چاہیئے جو سرے سے خدا ہی کے وجود میں ”نیک نیتی“ کے ساتھ شک رکھتا ہے کیونکہ یہ سب بھی اپنی وسعت علم و فکر ہی تک مکلف ہیں اور ان کے علم و فکر کی رسائی بھی وہیں تک ہے جہاں تک وہ پہنچے ہیں۔ اس قاعدہ کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو مومن اور کافر اور مشرک کا امتیاز سراسر لغو قرار پائے گا، اور تبلیغ دین کے لیے

سرے سے کوئی عقلی بنیاد ہی باقی نہ رہے گی، کیونکہ دین جن باتوں کی طرف بلاتا ہے ان کو اگر کوئی شخص اپنی کوتاہی فکر کی بنا پر "گر نیک نیتی" کے ساتھ رد کر دے، تب بھی وہ بر سر حق ہی رہے گا، اور اپنے اس فعل کے لیے کسی الزام یا کسی سزا کا مستحق نہ ہوگا۔

آپ اس قاعدہ کی بنا آیت لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا پر رکھتے ہیں۔ لیکن میں عرض کرتا ہوں کہ اگر اس آیت کا وہی مفہوم ہے جو آپ نے سمجھا ہے تو یہ آیت قرآن مجید کی پوری تعلیم کے خلاف ہے، اور اس صورت میں یہ تسلیم کرنا لازم آتا ہے کہ قرآن نے دو بالکل متعارض اصول پیش کئے ہیں۔ ایک طرف تو وہ انسان کو خدا اور اس کے ملائکہ اور کتابوں اور رسولوں اور آخرت پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے، اور کہتا ہے کہ اگر تم ان چیزوں کو نہ مانوگے تو کافر ہوگے اور تم کو آخرت میں سخت سزا دی جائے گی۔ دوسری طرف وہی قرآن (آپ کے زعم کے مطابق) کہتا ہے کہ تم صرف اپنی وسعت علم و فکر تک مکلف ہو، اور اگر تمہاری فکر کی رسائی ان پانچوں ایمانیات یا ان میں سے کسی ایک تک نہ ہو، اور اس نارسائی فکر کی بنا پر تم ایک کو یا سب کو ماننے سے انکار بھی کر دو، اور ان کے خلاف کوئی عقیدہ رکھو تب بھی تم پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اور تم کسی الزام سزا کے مستحق نہیں ہو۔ یقین مانیے کہ اگر قرآن مجید کی تعلیم میں حقیقتاً اتنا صریح تناقض موجود ہوتا تو کوئی صاحب عقل انسان اسکو خدا کی کتاب نہ مانتا۔

اس اشکال کا حل وہی ہے جو میں اپنے سابق مضمون میں بیان کر چکا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ تکلیف ہی نہیں دی ہے کہ وہ خود اپنی محدود قوتوں سے اسکی معرفت تک پہونچنے اور اسکی بندگی کا صحیح طریقہ دریافت کرنے کی کوشش کرے۔ خالق کائنات خوب جانتا تھا کہ انسان کی وسعت علم و فکر کہاں تک ہے۔ اسکو معلوم تھا کہ عام انسانوں کی قوت فکر اور صلاحیت اکتساب علم اتنی ہے ہی نہیں کہ وہ اس بلند مقام تک پرواز کر سکیں جہاں اس عظیم ماورائے سرحد ادراک ہستی کی معرفت حاصل ہوتی ہے، اور نہ وہ اپنی فطری اور خارجی کمزوریوں سے اتنے پاک اور منزہ ہو سکتے ہیں کہ محض اپنے اجتہاد سے اس ذات کے لیے اپنی بندگی کو خالص کر دیں۔ اس لیے اس نے ان کی وسعت و طاقت سے زیادہ ان پر تکلیف کا بار ڈالا ہی نہیں۔ اس نے تو ان میں سے خاص بندوں کا انتخاب کر کے ان کو ہدایت کا راستہ دکھا دیا اور ان کو اس بات پر مامور کیا کہ اپنے ابنائے نوع کو اس کی نشانیاں کھول کھول کر بتائیں، اور ان کی عقل و فہم

کے مطابق انہیں تعلیم دیں۔ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ فَمَنِ اتَّقٰی وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا ہُمْ یَحْزَنُوْنَ (۷: ۳۵) پس تکلیف جو کچھ بھی دی گئی ہے وہ اس امر کی ہے کہ انسان خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں کی سیرت اور ان کی تعلیم پر غور کرے، اور جب دیکھے کہ وہ جس راستے کی طرف بلا رہے ہیں اس میں انکی کوئی ذاتی غرض نہیں ہے، نہ وہ جھوٹ بولنے اور دھوکا دینے والے ہیں، نہ کسی ایسی بات کی طرف بلا رہے ہیں جو تقویٰ اور صلاح کے خلاف ہو، تو ان پر ایمان لائے اور انکی پیروی کرے۔ اس تکلیف کو تکلیف مالایطاق نہیں کہا جاسکتا۔ اگر ہدایت کو انسان کے علم و عقل سے آشنا قریب کر دینے کے باوجود کوئی شخص نیک نیتی یا بدنیتی سے اسکو قبول نہیں کرسکتا، اور اس کے خلاف چلتا ہے تو اسکو اپنی اس کوتاہی کا انجام ضرور دیکھنا پڑے گا۔

آپ پھر پلٹ کر کہیں گے کہ اگر کوئی شخص اپنی وسعت علم و فکر کی حد تک رسولوں کی سیرت اور انکی تعلیم پر غور کرنے کے باوجود انکی رسالت پر مطمئن نہ ہوسکے تو اس کوتاہی فہم و نارسائی فکر کی اس پر کوئی ذمہ داری نہیں اور اس کو مورد الزام و مستحق عذاب نہ ہونا چاہیئے۔ میں عرض کروں گا کہ جب کوئی شے انسان بحیثیت انسان کی عقل و فہم کے باہر ہو اور کوئی انسان اس تک نہ پہونچے تو البتہ وہ معذور ہے۔ کیونکہ اس شے کی یہ شان ہی نہیں ہے کہ انسان اس تک پہنچ سکے لیکن اگر کوئی چیز اس حد کے اندر ہو، اور اس کی شان یہ ہو کہ انسان بحیثیت انسان ہونے کے، اپنی عام بشری قوتوں کے ساتھ اس حد تک پہنچ سکتا ہو، اور پھر کوئی شخص اس تک نہ پہونچے تو یہ دو حال سے خالی نہ ہوگا۔ یا تو اس نارسائی میں اس کی ہوائے نفس کا دخل ہوگا، یا یہ نارسائی خالصۃً اسکی کوتاہی فہم پر مبنی ہوگی۔ پہلی صورت میں تو اس کے مجرم ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہوسکتا۔ رہی دوسری صورت تو آپ کو خواہ اس کم عقل انسان پر کتنا ہی رحم آئے، بہرحال اس سے آپ انکار نہیں کرسکتے کہ وہ اپنی کوتاہ فہمی سے جس نتیجہ پر پہونچا ہے وہ حق نہیں ہے، اور یہ کسی طرح بھی قرین انصاف نہیں کہ جو حق تک نہیں پہونچا ہے وہ انجام کار میں ان لوگوں کے برابر ہو جو حق تک پہونچ گئے ہیں۔

اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہے کہ ہر شخص جو کچھ سوچے اور سمجھے گا اپنی وسعت علم و فکر کی حد تک ہی سوچے اور سمجھے گا۔ اس حد سے آگے جانا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ آیا حق اور صداقت ہر شخص کی انفرادی

سمجھ بوجھ کے مطابق بدلنے والی چیز ہے یا ایک امر متعین ہے خواہ کوئی شخص اسکو سمجھے یا نہ سمجھے؟ اگر آپ پہلی بات کے قائل ہیں تو گویا آپ یہ کہتے ہیں کہ مثلاً ۳۰ اور ۵۰ کا مجموعہ کوئی مخصوص عدد نہیں ہے، بلکہ ہر شخص اپنی حد تک غور و فکر کرنے کے بعد نیک نیتی کے ساتھ جس عدد پر بھی پہنچ جائے وہی صحیح مجموعہ ہے خواہ وہ ۷۹ ہو یا ۸۱ یا ۸۰۔ مگر یہ ایسی غیر معقول بات ہے کہ آپ اس کے قائل نہیں ہوسکتے۔ لہذا آپ کو لامحالہ دوسری شق ماننی پڑے گی یعنی یہ کہ ۳۰ اور ۵۰ کا مجموعہ بہر حال ۸۰ ہے خواہ کسی کی حد علم و فکر وہاں تک پہنچے یا نہ پہنچے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جو شخص ۳۰ اور ۵۰ کے مجموعہ کو ۷۹ یا ۸۱ یا کچھ اور کہتا ہے، خواہ کوتاہ فہمی کی بنا پر نیک نیتی کے ساتھ ایسا کہے یا جان بوجھ کر بدنیتی کے ساتھ، دونوں صورتوں میں اسکا حساب غلط ہوگا، اسکی فرد حساب اس غلطی کی وجہ سے آخر تک غلط ہو جائیگی اور ساری تمام محنت جو اس نے فرد تیار کرنے میں صرف کی ہے ضائع ہو جائے گی۔ نیک نیتی اور بد نیتی کا کوئی دخل حساب کی صحت و عدم صحت میں نہیں ہے۔ نہ یہ ہوسکتا ہے کہ نیک نیتی کے ساتھ غلط حساب لگانے والے کو اس شخص کے برابر کر دیا جائے جس نے صحیح حساب لگایا ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہوگا کہ نیک نیت احمق کو اتنی سزا نہ دی جائے گی جتنی بدنیت شریر کو دی جائے گی۔

(۲) قرآن مجید کی ترتیب کے بارے میں جو کچھ عرض کیا گیا تھا اس سے یہ کہنا مقصود نہ تھا کہ آیات قرآنی میں کوئی ربط نہیں ہے، بلکہ اس بات کی طرف اشارہ مقصود تھا کہ قرآن مجید میں ایک مسئلہ پر تسلسل کے ساتھ یکجا بحث نہیں کی گئی ہے، بلکہ جہاں جیسا موقع پیش آیا ہے مسائل کے اطراف میں سے ایک طرف یا چند اطراف کو بیان کر دیا گیا ہے۔ اس لئے قرآن مجید کے مطالعہ کرنے والے کو لازم ہے کہ جب وہ کسی مسئلہ پر کوئی رائے قائم کرنا چاہے تو ان تمام اطراف پر نگاہ ڈالے جو مختلف آیات میں بیان ہوئے ہیں۔ اگر صرف ایک آیت یا چند آیات پر حصر کرے گا اور دوسری آیات کو جو اس مسئلہ سے تعلق رکھتی ہیں، نظر انداز کر دے گا تو صحیح رائے قائم نہ کرسکے گا۔

(۳) تعجب ہے کہ آپ نے سورۂ آل عمران کو چھٹے رکوع سے لے کر بارھویں رکوع تک بار بار پڑھا اور پھر بھی مشکل رفع نہ ہوئی۔ حالانکہ چھٹے رکوع کے آغاز ہی میں آپ دیکھ سکتے تھے کہ جو لوگ حضرت ابراہیم اور یعقوب اور یوسف اور موسیٰ اور دوسرے انبیائے بنی اسرائیل علیہم السلام پر ایمان رکھتے تھے ان کو بھی اس بنا پر

دنیا اور آخرت میں عذاب شدید کی دھمکی دی گئی ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ پر ایمان نہ لائے تھے؟ غور کیجئے کہ یہ لوگ مطلقاً رسالت کے منکر نہ تھے۔ صرف ایک رسول کا دعوائے رسالت سن کر انھوں نے اپنی وسعت علم و فکر تک غور کیا اور جب ان کا دل اس پر نہ ٹھکا تو انھوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ مگر اس پر لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کا وہ قاعدہ جو آپ تجویز فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے جاری نہ کیا بلکہ فرمایا تو یہ فرمایا کہ فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ نہ صرف اس مقام پر بلکہ قرآن میں کسی دوسری جگہ بھی کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ اس عذاب کی وعید سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو شرک سے مجتنب اور توحید و تقویٰ کے طریقہ پر قائم ہیں مگر حضرت عیسیٰ کی رسالت میں نیک نیتی کے ساتھ شک رکھتے ہیں۔

(۴) الجھن کی بڑی وجہ وہ آیت ہے جس میں اہل کتاب کو ایک کلمۂ سواء کی طرف بلایا گیا ہے، اور اس میں رسالت محمدی پر ایمان لانے کا ذکر نہیں ہے۔ قبل اس کے کہ اس آیت پر بحث کی جائے، آیت کے اصل الفاظ سن لیجیے:۔

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (۶۱۳)

اے محمد کہد کہ اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسے کلمہ کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی شے کو شریک نہ کریں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا ارباب نہ بنا لے۔ پھر اگر وہ اس دعوت سے روگردانی کریں تو کہدو کہ گواہ رہو، ہم مسلم ہیں۔

اس آیت میں کون سا لفظ ہے جس سے آپ نے یہ معنی نکالے کہ اس کلام سے مقصود یہود و نصاریٰ کو دعوت الی اللہ کے کام میں مسلمانوں کے ساتھ شرکت عمل کی دعوت دینا تھا؟ اور یہ کہاں کہا گیا ہے کہ "اگر تم اپنی سچی تعلیم پر عمل کرو گے اور شرک چھوڑ دو گے تو دعوت الی اللہ کے مشترک کام میں ہم اور تم یکساں ہوں گے؟ اور اس معنی کی طرف

کون سا اشارہ ہے کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان نہ لانے والے ایمان لانے والوں کی طرح حق پر ہیں اور ان کے برابر درجہ رکھتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کے سامنے اپنا دعوائے رسالت پیش کیا اور وہ آپ سے جھگڑا کرنے لگے (جیسا کہ آیت مباہلہ میں اس آیت سے اوپر ہی بیان کیا گیا ہے) تو اللہ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ تم ان کو اس بات کی طرف دعوت دو جو تمہارے اور ان کے درمیان مشترک ہے، یعنی یہ کہ

اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔

اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب اور اپنا الٰہ اور حقیقی متبوع نہ بناؤ۔

یہ تینوں باتیں وہ تھیں جو موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی اصل تعلیمات میں موجود تھیں مگر یہود و نصاریٰ ان کو چھوڑ بیٹھے تھے۔ نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ اور مریم علیہما السلام کو معبود بنا لیا تھا۔ یہودی اور نصرانی دونوں اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرنے لگے تھے (وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ۔ ۹: ۵) یہود و نصاریٰ دونوں نے اپنے احبار اور رہبان اور مسیح کو ارباب بنا لیا تھا (اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَٰهًا وَاحِدًا۔ ۹: ۵) چونکہ یہود و نصاریٰ کی گمراہی کا آغاز اسی سبب سے ہوا تھا کہ انھوں نے اصل موسوی اور مسیحی مذہب کی اس بنیادی تعلیم کو چھوڑ دیا تھا، اس لیے حکم ہوا کہ پہلے ان کو اس چیز کی طرف بلاؤ جو ان کے اصل مذہب کی بھی تعلیم ہے اور تمہارے دین کی بھی بنیاد ہے۔ اس دعوت سے دو فائدے مقصود تھے۔ ایک یہ کہ اہل کتاب میں سے جو تنا حق پسند اور سلیم الطبع ہوگا وہ اپنے مذہب کے صدیوں سے متوارث عقائد باطلہ کو چھوڑ دینے پر آمادہ ہو جائے گا اس کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت تسلیم کر لینے میں پھر کوئی مشکل حائل نہ رہے گی۔ دوسرے یہ کہ اس کلمۂ سواء کی دعوت سے یہود اور نصاریٰ دونوں کو معلوم ہو جائے گا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی چیز کی طرف بلانے والے ہیں جس کی طرف عیسیٰ اور موسیٰ اور دوسرے

انبیا علیہم السلام بلاتے تھے۔ پھر ان کی تصدیق کرنے والے کے لیے ان کی تکذیب کرنے کی کونسی معقول وجہ ہے۔

یہ اس آیت کا صاف اور واضح مفہوم ہے۔ اس سے یہ بات کہاں نکلتی ہے کہ اہل کتاب سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا مطالبہ نہ تھا؟ اور اس سے یہ بات کیسے نکالی جا سکتی ہے کہ اگر اہل کتاب صرف "اپنی سچی تعلیم" پر عمل کریں اور شرک چھوڑ دیں تو وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرنے یا آپ کی رسالت میں شک رکھنے کے باوجود ہدایت یافتہ اور مستحق نجات ہوں گے؟ کیا یہ آیت اس آیت کو منسوخ کرتی ہے جس میں تمام نوع انسانی کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا ...... فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ ..... لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۷ : ۲۰) اور کیا یہ آیت اس آیت کی بھی ناسخ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جو اس نبی کی نبوت اور اس کے لائے ہوئے پیغام کو نہ مانے گا وہ خسران میں رہے گا۔ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۲ : ۱۴) اور کیا یہ آیت ان آیات کی بھی ناسخ ہے جن میں خاص طور پر اہل کتاب سے کہا گیا ہے کہ ہمارا رسول تمہارے پاس آیا ہے (مائدہ ۳۔ اعراف ۱) کیا قرآن میں کوئی مثال ایسی ملتی ہے کہ کسی قوم کے پاس رسول بھیجا جائے اور وہ اسکو نہ مانے اور پھر بھی ہدایت یافتہ اور مستحق نجات ہی رہے؟ اگر خدا کی طرف سے آئے ہوئے رسول کو ماننا اور نہ ماننا دونوں یکساں ہوں، اور نہ ماننے کی صورت میں بھی اسی طرح نجات نصیب ہو سکے جس طرح ماننے کی صورت میں ممکن ہے، تو ارسال رسل سے بڑھ کر لغو اور عبث فعل اور کیا ہو گا؟ بظاہر ایسا خیال کرنے میں بڑی رواداری نظر آتی ہے۔ مگر حقیقت میں غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی طرف اس بات کو منسوب کرنا خدا کو حکمت سے عاری ثابت کرنا ہے۔

(۵) ضمن ج کے تحت آپنے جو کچھ فرمایا ہے اس کے جواب میں وہ بات کافی ہے جو میں ابھی عرض کر چکا ہوں مگر جن دو آیتوں کی طرف آپنے اشارہ فرمایا ہے ان کی مزید تشریح ضروری ہے۔ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ میں اٰمَنَ سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جن کا ذکر اہل کتاب کے لفظ سے کیا گیا ہے ان کا اہل کتاب ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اللہ پر، اپنی کتاب پر، اپنے رسول یا رسولوں پر، ملائکہ

اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہیں۔ اب آپ ہی فرمایئے کہ کس پر ایمان لانے کی کسر باقی رہ گئی؟ اسی طرح مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ میں انہی اہل کتاب میں سے بعض کو جب مومن کہا گیا ہے تو اس کا مفہوم بھی بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہ مومنین وہ اہل کتاب ہیں جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے؟ اور معلوم ہے کہ وہ چند ہی تھے، ان میں سے اکثر ایمان نہیں لائے اور انہی کو "فاسق" کہا گیا ہے۔ میں نے ترجمے میں ماضی اور حال کا فرق محض مفہوم کو واضح کرنے کے لئے کر دیا تھا۔ ورنہ اگر آیت کا ترجمہ اس طرح کیا جائے کہ "ان میں سے بعض مومن ہیں اور بعض فاسق" تو اس سے بھی مفہوم نہیں بدلتا۔

رہی دوسری آیت تو اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اہل کتاب میں بھی مدارج کا فرق ہے۔ ان میں سے جو گروہ راتوں کو عبادت کرتا اور کتاب پڑھتا ہے اور خدا اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہے، اور پرہیزگاری کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے، اور نہ صرف خود نیکوکار ہے بلکہ دوسروں کو بھی نیکی کا حکم دیتا اور بدی سے روکتا ہے، وہ اس گروہ سے تو بہر حال بہتر اور بلند تر درجہ میں ہے جو آیات الٰہی کا منکر اور حق سے تجاوز کرنے والا، اور بدکار و نافرمان ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ان دونوں گروہوں کو یکساں سمجھا جائے اور ان کا انجام ایک ہی سا ہو تو یہ عدل کے خلاف ہوگا۔ ان بدکاروں کے مقابلہ میں ان نیکوکاروں کی قدر یقیناً ہونی چاہیے اور ہوگی بھی مگر یہ پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ ان متقی اور نیک اہل کتاب کے حق میں بھی بہتر یہی تھا کہ وہ نبی امی پر ایمان لے آتے (وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ) کیونکہ خدا نے جس نبی کو بھی بھیجا ہے، اسی لیے بھیجا ہے کہ اسکی بات مانی جائے (وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ) اور جو شخص خدا کے رسول کی بات نہیں مانتا وہ دراصل خدا کی بات نہیں مانتا (مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ) اسی کا نام "فسق" ہے (مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ) اور فسق کرنے والے کو دار الفاسقین ضرور دکھایا جائے گا۔

(۶) آیت يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ کی تفسیر میں جو کچھ میں نے عرض کیا ہے وہ کلمۂ شک کے ساتھ ہے میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ پرہیزگار اور صالح اہل کتاب کو اللہ کی رحمت میں سے کتنا حصہ

ملیگا اور ان کے اعمال کی قدر کس صورت میں ہوگی؟ اس کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے، اور اللہ نے اپنی کتاب میں جب اس کی کوئی تصریح نہیں کی ہے تو مجھے اور کسی کو بھی اپنی رائے سے اسکی تعیین کرنے کا کوئی حق نہیں۔ میں یقین کے ساتھ جو کچھ کہہ سکتا ہوں وہ بس اسی قدر ہے کہ نہ تو وہ اس ادنیٰ درجہ میں رکھے جائیں گے جو بدکار کافروں کے لیے ہے، اور نہ ان کامل الایمان لوگوں کے ہم مرتبہ کر دیئے جائیں گے جو تمام رسولوں کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور تمام کتابوں کے ساتھ قرآن مجید پر ایمان لائے ہیں۔

قرآن اور سنتِ رسولؐ

حضرت محترم ادام اللہ فضلکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ! میں متواتر ضرورت حدیث کے سلسلہ میں آپکا سلسلہ مضامین دیکھ چکا ہوں۔ میں نہ تو اُن غالی مخالفین احادیث سے ہوں کہ کسی قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹھکرا دوں اور نہ کورانہ روایات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوں آپ سے ان دو اصولوں کے ماتحت امسال کے ماہ نامہ اول کے اشارات کی دی ہوئی اجازت کی رو سے کہ صرف تحقیق کے زاویۂ نگاہ سے ہے درخواست کرتا ہوں کہ آپ میری اور میرے احباب کی تسلی فرمائیں۔

اصول نمبر (۱) : قرآن حکیم نجات کے لیے کافی ہے یا نہیں؟ اگر کافی ہے تو تفصیلات نماز وغیرہ جو غیر از قرآن ہیں کیوں فریضہ ادلین قرار دی جائیں؟

مزید قابل غور امر یہ ہے کہ باقی ارکان اسلام مثلاً زکوٰۃ۔ حج (جو سال میں یا عمر بھر میں ایک دفعہ ادا کرنے ضروری ہیں) کی تفصیلات تو قرآن بیان کرتا ہے لیکن نماز جو ایک دن میں ۵ دفعہ ادا کرنی ضروری ہے اس کی تفصیلات رکعتیں وغیرہ کیوں بیان نہیں کرتا؟

اصول نمبر (الف) مسلمانوں کی تباہی کا سبب کیا روایات نہیں ہیں؟

(ب) کوئی قوم جس کا شیرازہ منتشر ہو گیا ہو اور جس کے لیے مختلف آرڈر موجود ہوں اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک ایک آرڈر پر اصول وحدت نہ ہو جائے۔ کیا روایات کے قبول کرتے ہوئے مسلم قوم کے لیے آپ ایک آرڈر کی توقع رکھ سکتے ہیں؟ میرا ایمان ہے کہ اس وقت مسلمان صرف وحدت و یگانگت اور اتحاد دلی سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ اصولاً اس وحدت کا حل آپ کیا تجویز کریں گے۔

خادم عبد الحمید مرزا۔ سیالکوٹ

ترجمان القرآن۔ آپ نے جو سوالات کیے ہیں وہ اتنے پیچیدہ نہیں ہیں کہ تھوڑے سے تامل سے خود آپ ہی ان کا جواب نہ پا لیتے۔ ترجمان القرآن کے اُن مضامین میں بھی جن کا آپ نے حوالہ دیا ہے، ان میں سے بعض سوالات کا حل موجود ہے تاہم جب آپ کو ان مسائل میں الجھن پیش آ رہی ہے اور کچھ دوسرے لوگ بھی اس الجھن میں مبتلا ہیں تو ان کی تشفی کے لیے مختصراً کچھ عرض کیا جاتا ہے:۔

(۱) قرآن حکیم "نجات" کے لیے نہیں بلکہ "ہدایت" کے لیے کافی ہے۔ اس کا کام صحیح فکر اور صحیح عمل کی راہ بتانا ہے، اور اس رہنمائی میں وہ یقیناً کافی ہے۔ مگر نجات کے لیے صرف قرآن کا پڑھ لینا کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم خلوص نیت کے ساتھ اسکی بتائی ہوئی راہ پر چلیں اور وہی اعتقاد رکھیں جس کی تعلیم قرآن نے دی ہے، اور اسی قانون کے مطابق عمل کریں جس کے اصول قرآن نے مقرر کیے ہیں۔

(۲) ہدایت کے لیے قرآن کے کافی ہونے کا مفہوم بھی عام طور پر غلط سمجھا جاتا ہے۔ کسی کتاب کے متعلق جب ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ کسی علم یا فن کی تعلیم کے لیے کافی ہے، تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس فن کے جتنے گر ہیں، یا اس علم کے جتنے اُمہات مسائل ہیں وہ سب اس کتاب میں آ گئے ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہر شخص جو اس کتاب کے الفاظ کو پڑھ سکتا ہو، اس کے تمام مطالب پر حاوی ہو جائے گا، اور محض کتاب کے مطالعہ ہی سے اسکو اپنے فن میں اتنی مہارت بھی حاصل ہو جائیگی کہ وہ عملاً اس سے کام لے سکے۔ کتاب اپنی جگہ کتنی ہی کامل سہی۔ لیکن دوسری طرف اسکو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک طرف تو خود طالب علم میں ایک خاص استعداد موجود ہو، اور دوسری طرف ایک ماہر فن استاد بھی موجود ہو جو نہ صرف کتاب کے

مطالب کی توضیح و تشریح کرے، بلکہ مشاہدہ اور مشق و تمرین کے ذریعہ سے فن کی وہ عملی تفصیلات بھی سکھا دے جو نہ تو کتابیں پوری طرح بیان ہو سکتی ہیں، اور نہ محض کتابیں پڑھنے سے کوئی ان پر علم و عمل کے اعتبار سے حاوی ہو سکتا ہے۔ بس یہی حال قرآن مجید کا بھی ہے۔ وہ اس لحاظ سے ہدایت کے لیے کافی ہے کہ اس میں وہ صحیح علم موجود ہے جس کی روشنی میں انسان صراط مستقیم پر چل سکتا ہے اور وہ تمام اصول اس میں بیان کر دیئے گئے ہیں جن پر اللہ کا پسندیدہ دین قائم ہے۔ مگر اس علم سے فائدہ اٹھانے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ طالب علم استفادہ کی خالص نیت رکھتا ہو اور ان علوم سے واقف ہو جو قرآن کو سمجھنے کے لیے ضروری ہیں۔ دوسرے یہ کہ ایک ماہر فن استاد موجود ہو جو کتاب اللہ کے نکات سمجھائے، آیات کا صحیح معنی و مفہوم بتائے، احکام پر خود عمل کر کے دکھائے، اور اصول قوانین کو عملی زندگی میں نافذ کر کے ان کا تفصیلی ضابطہ مقرر کر دے۔ پہلی چیز کا تعلق ہر شخص کی اپنی ذات سے ہے۔ رہی دوسری چیز تو اس کا انتظام اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے۔ کتاب کے ساتھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اسی غرض سے بھیجا گیا تھا کہ آپ اس ماہر فن استاد کی ضرورت کو پورا کریں۔ آپ نے استاد کی حیثیت سے جو کچھ بتایا اور سکھایا ہے وہ بھی اسی طرح خدا کی طرف سے ہے جس طرح قرآن خدا کی طرف سے ہے۔ اسکو "غیر از قرآن" کہنا صحیح نہیں ہے۔ جو شخص اسکی ضرورت کا منکر ہے، اور قرآن کو اس معنی میں کافی کہتا ہے کہ اس کو سمجھنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کے لیے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی علمی و عملی ہدایت کی حاجت نہیں ہے، وہ درحقیقت یہ کہتا ہے کہ صرف قرآن کی تنزیل کافی تھی۔ خدا نے نعوذ باللہ یہ فعل عبث کیا کہ اس کے ساتھ رسول کو بھی مبعوث کیا۔

(۴) آپ پوچھتے ہیں کہ "تفصیلات نماز وغیرہ جو "غیر از قرآن" ہیں کیوں فریضہ اولین قرار دی جائیں"؟ اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی تفصیلات نماز وغیرہ کو غیر از قرآن کہنا ہی سرے سے غلط ہے۔ اگر کوئی ماہر فن طبیب فن طب کے کسی قاعدہ کو عملی تجربہ کر کے شاگردوں کو سمجھائے تو آپ اسے خارج از فن نہیں کہہ سکتے۔ اگر کوئی پروفیسر اقلیدس کے کسی مسئلہ کو اشکال کھینچ کر تشریح و تفصیل کے ساتھ سمجھائے تو آپ اس کو "غیر از اقلیدس" نہیں کہہ سکتے۔ ہر علم و فن کی اصولی کتابوں میں صرف اصول اور اہمات مسائل بیان کر دیئے جاتے ہیں، اور عملی تفصیلات

استاد کے لیے چھوڑ دی جاتی ہیں، کیونکہ استاد عملی مظاہرے سے جس بات کو چند لمحوں میں بتا سکتا ہے، اسی کو اگر الفاظ میں بیان کیا جائے تو صفحے کے صفحے سیاہ ہو جائیں اور پھر بھی شاگردوں کے لیے لفظی بیان کے مطابق ٹھیک ٹھیک عمل کرنا مشکل ہو جائے۔ کتاب کے حسن کلام اور اس کے کمال ایجاز کا غارت ہو جانا مزید برآں۔ یہ حکیمانہ قاعدہ جس کو معمولی انسان تک اپنے علوم و فنون کی تعلیم میں ملحوظ رکھتے ہیں، آپ کی خواہش ہے کہ وہ سب سے بڑا حکیم جس نے قرآن نازل کیا ہے اس کو نظر انداز کر دیتا۔ آپ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں نماز کے اوقات کا نقشہ بتاتا۔ رکعتوں کی تفصیل دیتا، رکوع و سجود اور قیام و قعود کی ہیئتیں تفصیل کے ساتھ بیان کرتا، بلکہ نماز کی رائج الوقت کتابوں کی طرح ہر ہیئت کی تصویر بھی مقابل کے صفحات پر بنا دیتا، پھر تکبیر تحریمہ سے لیکر سلام تک نماز میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے وہ بھی لکھتا، اور اس کے بعد وہ مختلف جزئی مسائل تحریر کرتا جن کے معلوم کرنے کی ہر نمازی کو ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح قرآن کے کم از کم دو تین پارے صرف نماز کے لیے مخصوص ہو جاتے۔ پھر اسی طور پر دو دو تین تین پارے روزہ، حج اور زکوٰۃ کے تفصیلی مسائل پر بھی مشتمل ہوتے۔ اس کے ساتھ شریعت کے دوسرے معاملات بھی جو قریب قریب زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہیں، جزئیات کی پوری تفصیل کے ساتھ درج کتاب کیے جاتے۔ اگر ایسا ہوتا تو بلاشبہ آپ کی یہ خواہش تو پوری ہو جاتی کہ شریعت کا کوئی مسئلہ "غیر از قرآن" نہ ہو۔ لیکن اس سے قرآن مجید کم از کم انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے برابر ضخیم ہو جاتا، اور وہ تمام فوائد باطل ہو جاتے جو اس کتاب کو محض ایک مختصر سی اصولی کتاب رکھنے سے حاصل ہوئے ہیں۔

(۴) یہ تو آپ کو بھی تسلیم ہے کہ قرآن حکیم میں نماز وغیرہ کی تفصیلات بیان نہیں کی گئی ہیں بلکہ صرف ارکان اسلام کی فرضیت پر زور دیا گیا ہے، ان کے قائم کرنے کی بار بار تاکید کی گئی ہے، اور کہیں کہیں ان کے ادا کرنے کے طریقوں کی طرف بھی اشارات کر دیئے ہیں جو عملی تفصیلات پر کسی طرح بھی مشتمل نہیں کیے جا سکتے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان تفصیلات کو مقرر کرنے والا کون ہے؟ کیا وہ ہر شخص کے اختیار تمیزی پر چھوڑ دی گئی ہیں کہ جو جس طرح چاہے عمل کرے؟ اگر ایسا ہوتا تو دو مسلمانوں کی نمازیں بھی شاید ایک طریقے پر نہ ہوتیں۔ نہ دوسرے ارکان اسلام کے عملی طریقوں میں مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کی ہم آہنگی پائی جاتی۔ آج آپ جس "شیرازۂ قومی" کے انتشار کا ماتم فرما رہے ہیں، وہ صرف چند

"آرڈروں" کے اختلاف کی وجہ سے ہے۔ تاہم ہر آرڈر میں لاکھوں کروڑوں مسلمان مجتمع ہیں۔ لیکن اگر ہر شخص قرآن کے احکام کی عملی تفصیلات مقرر کرنے میں مختار رہتا، تو اسلام کے پیرووں میں سرے سے کوئی آرڈر ہی نہ ہوتا۔ ان مختلف افراد کو جس چیز نے ایک قوم بنایا ہے وہ اعتقاد و عمل کی یک رنگی و یکسانی کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اور یہ معلوم ہے کہ نظام جماعت کو قائم کرنے میں اعتقاد کے اشتراک سے بڑھ کر عمل کا اشتراک کارگر ہوتا ہے، کیونکہ انسان حواس کا بندہ ہے، اور اس کے حواس کو محسوس صورتیں ہی متاثر کر سکتی ہیں، اور انہی صورتوں کی یکسانی و یک رنگی اس میں جمعیت کا احساس پیدا کرتی ہے۔ لہٰذا طریقہائے عمل کو افراد کے اختیار پر چھوڑ دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ محض اعتقاد کے اشتراک سے مسلمان کبھی ایک قوم نہ بن سکتے۔ پھر جب وحدت قومی کے لئے اتحاد عمل ناگزیر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں وہ تفصیلات نہیں دیں جن سے یہ اتحاد حاصل ہو سکتا تھا تو آخر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کون تھا جس کے مقرر کئے ہوئے طریقوں کو تمام امت بالاتفاق واجب التقلید سمجھتی اور جس کی پیروی پر ہر زمانے اور ہر ملک کے کروڑوں تبعین اسلام مجتمع ہو جاتے؟ یہ آنحضرت ہی کا فیض تعلیم تو ہے جس کی بدولت آج ساڑھے تیرہ سو برس سے تمام مسلمان ایک ہی ہئیت سے نماز پڑھتے ہیں، ایک ہی طریقہ سے حج کرتے ہیں، ایک ہی زمانہ میں ایک ہی طرح روزے رکھتے ہیں۔ فرق جو کچھ بھی ہے محض جزئیات کا ہے، اور وہ بھی اس بنا پر نہیں ہے کہ کوئی مسلمان خود اپنے آپ کو ان جزئیات کے مقرر کرنے کا حق دار سمجھتا ہے، بلکہ اس بنا پر ہے کہ ہر گروہ اپنے علم کے مطابق اسی جزئیہ کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے مسنون سمجھتا ہے جس پر وہ عامل ہے۔ باقی رہی حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی امامت، اور آپ کی سنت کا واجب التقلید ہونا تو گنتی کے چند افراد کے سوا تمام امت اس پر متفق ہے، اور اسی اتفاق پر مسلمانوں کی وحدت دینی کا انحصار ہے۔

(۵) آپ قرآن مجید میں ایک مرتبہ پھر غور سے ملاحظہ فرمائیے کہ اس میں روزہ، حج، اور زکوٰۃ کی تفصیلات کہاں ہیں؟ زکوٰۃ کے متعلق تو یہ بھی نہیں بتایا گیا ہے کہ کن چیزوں پر کتنی زکوٰۃ دی جائے، اور زکوٰۃ کا نصاب کیا ہے؟ حج اور روزہ کے جن احکام کو آپ تفصیلات سے تعبیر کر رہے ہیں وہ نماز کے احکام سے بھی زیادہ مجمل ہیں۔ آپ غور سے دیکھیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ قرآن مجید میں اول سے آخر تک اس قاعدہ کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ دوران بیان ایمانیات کی

تعلیم میں صرف کیا جائے کیونکہ وہی دین کی بنیاد ہیں، اور عبادات و معاملات کے صرف اصول، اور امہات مسائل بیان کر کے تفصیلات کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر چھوڑ دیا جائے۔

(۶) مسلمانوں کی تباہی کا سبب روایات نہیں ہیں بلکہ نفسانیت، اور عصبیتِ جاہلیہ، اور فروع کو اصول سے بڑھ کر اہمیت دینے کی حماقت، اور کتاب اللہ و سنت رسول ؐ کو چھوڑ کر اپنے مزعومات میں حد سے زیادہ غلو کرنے کی عادت، اور نئے نئے طریقے ایجاد کرنے کا شوق ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو روایات کے اختلاف سے کوئی فتنہ پیدا نہیں ہو سکتا، کیونکہ روایات خواہ ضعیف ہوں یا قوی، اور ان کے درمیان خواہ کتنا ہی اختلاف پایا جاتا ہو، بہرحال ان سب کا مرجع رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے، اور ان مختلف روایتوں کو ماننے والے اس امر میں بہرطور متفق ہیں کہ وہ سب آنحضرت صلعم کو اپنا متبوع اور پیشوا مانتے ہیں۔ علاوہ بریں روایات کے اختلاف سے صرف فروع میں اختلاف واقع ہوتا ہے۔ باقی رہے اصول دین تو وہ سب کے سب کتاب پاک میں موجود ہیں جو روایات سے بالاتر، اور تمام مسلمانوں میں مشترک ہے۔ پس اگر مسلمان خلوص نیت کے ساتھ اس حقیقت کا ادراک کر لیں کہ وہ سب کتاب اللہ کے ماننے والے اور رسول اللہ ؐ کا اتباع کرنے والے ہیں، اور ان کے درمیان اصولِ دین مشترک ہیں، تو وہ اختلاف مٹ سکتا ہے جو تمام فتنوں کا منبع ہے۔ اور اگر اس کا ادراک نہ ہو تو روایات کا سارا دفتر نذر آتش کر دینے سے بھی اختلاف دور نہیں ہو سکتا۔ انسان کے نفس میں وہ شیطان موجود ہے جو قرآن کو بھی جنگ و جدل کا آلہ بنانے سے نہیں چوکتا۔

(۷) "ایک آرڈر" آپ کس معنی میں چاہتے ہیں؟ اگر آپ کا مقصد یہ ہے کہ فروع میں کوئی اختلاف نہ ہو تو جب تک انسان کی فطرت نہ بدل جائے، یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ بشری فطرت کے ساتھ تو یہ بھی ممکن نہیں کہ صرف دو ہی آدمیوں کا نقطۂ نظر بالکلیہ ایک ہو جائے۔ لہٰذا ایسا "ایک آرڈر" تو کبھی قائم نہیں ہو سکتا جس میں کسی نوع کا اختلاف رائے اور اختلاف عمل سرے سے موجود ہی نہ ہو۔ ہاں اگر آپ "ایک آرڈر" سے مراد ایسا آرڈر لیتے ہیں جو اصولوں کی وحدت پر مبنی ہو تو خدا کی کتاب اور اس کے رسول ؐ نے ایسا ہی آرڈر قائم کیا تھا، اور

وہ ہر وقت قائم ہو سکتا ہے بشرطیکہ مسلمان اصول اور فروع کا فرق سمجھ لیں اور دونوں کے مراتب میں امتیاز کرنا سیکھ جائیں۔

حدیث ادبر الشیطان لہ ضراط

جمادی الاولیٰ کے اشارات میں حدیث اذا نودی للصلوٰۃ ادبر الشیطان لہ ضراط کی جو شرح کی گئی تھی اس پر لاہور کے ایک صاحب نے اعتراض کیا ہے۔ ان کا خط بجنسہٖ اسلیے درج نہیں کیا جاتا کہ اسکی زبان نامناسب ہے، اور اس میں علماء اہل حدیث کے لیے سخت الفاظ استعمال کیے گئے ہیں خلاصہ ان کے اعتراض کا یہ ہے :-

"آپ نے بخاری کے ادبر الشیطان لہ ضراط کو مسلم کے لہ حصاصٌ کے سامنے بے حقیقت اور محض استعارہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اور ان لوگوں کو کودن قرار دیا ہے جو حدیث بخاری کے الفاظ کو ظاہر پر محمول کرکے یہ فرض کر لیتے ہیں کہ شیطان پیٹ رکھتا ہے اور اس سے ریاح خارج ہوتے ہیں۔ لیکن علماء اہل حدیث اس سے متفق نہیں ہیں۔ ان کے لٹریچر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک شیطان کا مجسم ہونا اور اس کے پیٹ سے ریاح کا خارج ہونا ایک مسلّم حقیقت ہے۔ با ایں ہمہ آپ کے جواب سے نفس اعتراض پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ اصل اعتراضات ہنوز طے نہیں ہوئے۔ از انجملہ ایک عام اعتراض جو روز سننے میں آتا ہے یہ ہے کہ اذان سن کر شیطان کا بھاگ جانا مگر نماز پڑھنے کی حالت میں معًا پھر نہ صرف لوٹ آنا بلکہ نمازیوں کے دل و دماغ پر مسلط ہو جانا آخر کیا معنی رکھتا ہے؟ آیا اذان نماز سے بہتر ہے یا خود نماز میں ایسی کوئی خرابی موجود ہے جس کے باعث شیطان کو ایسے تسلط کا موقع مل جاتا ہے کہ از روئے روایات خود رسول اللہ ؐ کم رکعتیں بھول جاتے اور بروئے حکایت علماء امام غزالیؒ تک نماز میں نفس نماز سے منحرف ہو کر اِدھر اُدھر کے خیالات میں منہمک ہو جاتے تھے؟ براہ مہربانی واضح طور پر بتلایئے کہ نماز میں بمقابلہ اذان کے شیطانی تسلط قائم ہونے کی وجہ کیا ہیں؟"

میں نے حدیث بخاری کے الفاظ کو حدیث مسلم کے الفاظ کے سامنے بے حقیقت ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ صرف یہ کہا تھا کہ مسلم میں جو الفاظ آئے ہیں وہ حدیث بخاری کے الفاظ کی تفسیر کرتے ہیں مختلف احادیث پر نظر ڈالنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر اذان کی تاثیر کو مختلف طریقوں سے بیان فرمایا ہے۔ ان سب ارشادات کو ملا کر پڑھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اصل مقصد اذان کا یہ اثر بیان کرنا تھا کہ اس کو سن کر شیطان بھاگ جاتا ہے، اور اس کے دوران میں انسان شیطانی وساوس سے محفوظ رہتا ہے۔

علماء اہل حدیث کی رائے اگر اس سے مختلف ہے تو ان کے دلائل معلوم ہونے کے بعد میں کچھ عرض کر سکونگا میں نے جہاں تک کتاب اللہ کا مطالعہ کیا ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس اور اس کی ذریت اور جن انسان وحیوان کی طرح مادی جسم نہیں رکھتے، بلکہ آتشین مخلوق ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ابلیس کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ۔ اور جنوں کے متعلق حق تعالیٰ شانہٗ نے فرمایا ہے کہ وَخَلَقَ الْجَانَّ مِن مَّارِجٍ مِّن نَّارٍ۔ اور ابلیس کے متعلق ارشاد ہے کہ كَانَ مِنَ الْجِنِّ۔ ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ شیطان کی حقیقت انسان سے مختلف ہے۔ نہ وہ انسان کا سا جسم رکھتا ہے اور نہ اس پر وہ احوال گزرتے ہیں جو انسان پر گزرا کرتے ہیں، مثل اکل طعام واخراج ریاح وغیرہ۔ باقی رہی یہ بات کہ حدیث نبوی کے الفاظ لہ ضراط کو شیطان کے صاحب شکم ہونے اور اس سے ریاح خارج ہونے کے لیے دلیل قرار دیا جائے تو میرے خیال میں یہ صحیح نہیں ہے۔ لغت عرب میں ضراط کا لفظ محض ریح شکم کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ مجازاً بہت سے معانی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً خفت کے معنی میں، چنانچہ بالوں کی کمی کو الضرط کہتے ہیں اور جس شخص کی ڈاڑھی ہلکی ہو اس کو اَضرط کہا جاتا ہے۔ جس عورت کی بھویں ہلکی ہوں وہ ضرطاء کہلاتی ہے۔ انکار اور استخفاف کے معنی ہیں۔ یقال اضرط فلان بفلان اذا استخف بہ وسخر منہ۔ اور حدیث علی رضی اللہ عنہ میں ہے کہ انہ دخل بیت المال فاضرط بہ ای استخف بہ وسخر منہ۔ ناپسندیدگی اور کراہت کے معنی ہیں۔ وفی المثل الاکل سرطان والقضاء ضرطان۔ وتاویل ذالک تحب ان تاخذ وتکرہ ان ترد اس سے

معلوم ہوتا ہے کہ حدیث میں شیطان کے بھاگنے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے حضور نے "ضراط" جو فرمایا ہے، اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ بھاگتے وقت فی الواقع اس کے پیٹ سے ریاح خارج ہوتے ہیں بلکہ اس سے مراد ایسی شدت فرار ہے جس میں خوف اور کراہت اور گھبراہٹ بھی شامل ہے۔ خود ہماری زبان کے محاورات میں بھی گوز کرنے کا لفظ حقیقی معنی پر محمول نہیں کیا جاتا بلکہ اس سے اضطراب اور خوف اور بدحواسی اور عجز وغیرہ کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کہیں کہ فلاں شخص گوز کرتا ہوا بھاگا تو کوئی بھی اس کا یہ مفہوم نہیں لیتا کہ فی الواقع بھاگتے وقت اس کے پیٹ سے ریاح خارج ہو رہے تھے، بلکہ اس سے یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ سخت بدحواسی اور خوف کی حالت میں بھاگا۔ پس جب انسان کے متعلق یہ الفاظ سن کر آپ ان کو حقیقت پر محمول نہیں کرتے، حالانکہ انسان پیٹ رکھتا ہے اور اس سے ریاح خارج ہونا ایک امر طبعی ہے، تو پھر شیطان کے حق میں یہ الفاظ سن کر آپ ان کو حقیقت پر کس طرح محمول کر سکتے ہیں، درانحالیکہ وہ انسان و حیوان کا سا جسم نہیں رکھتا؟

میں اپنے محدود علم کی بنا پر اس حدیث کے معنی کی جو تحقیق کر سکتا تھا وہ میں نے بیان کر دی ہے۔ اگر کوئی شخص میری تحقیق کو غلط ثابت کر دے تو میں اس سے رجوع کرنے میں کبھی تامل نہ کروں گا۔ الحمدللہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اپنی رائے کو وحی و الہام سمجھتے، اور اختلاف کرنے والوں کو گالیاں دیتے ہیں۔

رہا آپ کا یہ سوال کہ جب اذان سن کر شیطان بھاگ جاتا ہے تو نماز پڑھنے میں واپس کیوں آ جاتا ہے؟ اور کیا نماز اذان سے فروتر چیز ہے؟ تو اس کا جواب میرے ذمہ نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ سے دریافت کرنا چاہیئے کہ اس نے اذان اور نماز کے درمیان کیا فرق رکھا ہے جس کا یہ اثر ہے۔ یا پھر شیطان سے پوچھنا چاہیئے کہ تو اذان کی آواز سن کر بھاگ کیوں جاتا ہے اور نماز پڑھنے میں واپس کیوں آ جاتا ہے؟ مگر ایک بات میں بھی آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ حدیث میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے آیا وہ صحیح ہے یا نہیں؟ آپ کا خود اپنا تجربہ اس کی تصدیق کرتا ہے یا نہیں؟ دوسرے نماز پڑھنے والوں کے تجربات بھی اس کی تائید کرتے ہیں یا نہیں؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اذان کی آواز سن کر ہر نمازی مسلمان کا دل یکایک ذکر الٰہی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، اور یہ چند لمحے شیطانی وساوس سے خالی گزرتے ہیں، لیکن نماز پڑھتے میں طرح طرح کے خیالات آ کر اس کو گھیر لیتے ہیں، اور ایسی ایسی باتیں یاد آتی ہیں جو نماز شروع کرنے سے پہلے اس کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں ہوتیں؟ اگر واقعہ ہے اور آپ کا ذاتی تجربہ

بھی اس کا شاہد ہے تو آپ اسکی تصدیق کو اسکی وجہ معلوم ہونے پر کیوں موقوف رکھتے ہیں؟ کیا واقعہ کو واقعہ تسلیم کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ آپکو اسکی وجہ معلوم ہو جائے؟ اگر کسی واقعہ کی وجہ نہ معلوم ہو تو کیا آپ اس کے واقعہ ہونے سے انکار کر دیں گے؟ اگر آپکے سر میں درد ہو اور اسکی وجہ سمجھ میں نہ آئے تو کیا آپ اپنے احساس درد کو جھٹلا دینگے؟ یہ بات تو ایک ادنیٰ عقل عام COMMON SENSE سے تعلق رکھتی ہے کہ واقعہ کو واقعہ ماننے کے لیے وجہ کا معلوم ہونا شرط نہیں ہے۔ آپ دنیا کے بہت سے واقعات کو تسلیم کرتے ہیں درانحالیکہ آپکو انکی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ پھر آخر یہ حجت طلبی مذہبی لٹریچر ہی کے ساتھ کیوں مخصوص ہو گئی ہے کہ اگر اس کے کسی بیان کی تائید تجربہ و مشاہدہ سے بھی ہو جائے تو اسے ماننے کو دل نہیں چاہتا جب تک کہ اسکی وجہ معلوم نہ ہو جائے؟ اور اگر اسکی وجہ بھی معلوم ہو جائے تو پھر تصدیق میں یہ سوال مانع ہو جاتا ہے کہ جب اس خاص معاملہ میں یہ واقعہ پیش آتا ہے تو ایک دوسرے معاملہ میں بھی یہی واقعہ کیوں پیش نہیں آتا؟

آپ پوچھتے ہیں کہ کیا نماز اذان سے بہتر ہے یا نماز میں کوئی ایسی خرابی موجود ہے جس کے باعث حالت نماز میں شیطان کو تسلط کا موقع مل جاتا ہے؟ میں کہتا ہوں کہ شیطان کے بھاگ جانے اور واپس آجانے سے نہ تو نماز پر اذان کی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور نہ نماز میں کسی خرابی کا موجود ہونا لازم آتا ہے۔ اس سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ اذان اور نماز کی کیفیات میں فرق ہے۔ شیطان کے لیے ان دونوں میں جو کچھ فرق ہے اسکو ہم نہیں جان سکتے، نہ وہ ہم کو بتایا گیا ہے۔ البتہ نفس انسانی کے لیے ان دونوں میں جو فرق ہے وہ ہم سمجھ سکتے ہیں۔ نفسیات کا ایک معمولی نکتہ ہے کہ جب کوئی آواز انسان کی توجہ کو دفعتہً اپنی طرف جذب کرتی ہے تو تھوڑی دیر کے لیے انسان کا نفس دوسرے مشاغل سے ہٹ کر اسکی جانب متوجہ ہو جاتا ہے۔ مگر جب انسان کسی کام میں زیادہ دیر تک مشغول رہتا ہے تو بغیر خاص کوشش کے اسکو پوری جمعیت خاطر — CNOCENTRATION حاصل نہیں ہوتی، اور خیالات ادھر ادھر بھٹکنے لگتے ہیں۔ عوام پر یہ حالت اکثر گذرتی ہے کیونکہ وہ جمعیت خاطر اور کامل توجہ الی اللہ بہم پہنچانے پر کم قادر ہوتے ہیں لیکن خواص بھی باوجود خاص قدرت رکھنے کے کبھی کبھی بتقاضائے بشریت بعض اضطراری طور پر انتشار خیال میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اذان اور نماز کا یہ فرق دونوں کی کیفیتوں کے فرق پر مبنی ہے نہ کہ اُنکی جناب میں انکی مقبولیت اور ان کے مراتب کے فرق پر۔

مطبوعات

تصدیق احمدیت از جناب سید بشارت احمد صاحب جنرل سکرٹری جماعت احمدیہ حیدرآباد - دکن ضخامت ۲۲۲ صفحہ -
ملنے کا پتہ :- احمدیہ کتاب گھر، جوبلی ہال، افضل گنج، حیدرآباد - دکن -

یہ کتاب، الحاج مولوی محمد الیاس برنی صاحب استاذ معاشیات کلیۂ جامعہ عثمانیہ کی تالیف "قادیانی مذہب" کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ لائق مجیب نے نہایت کاوش و محنت سے اپنے پیشوا اور ان کے خلفاء و متبعین کی تحریرات کی تشریح و تاویل کی ہے۔ لیکن مذہبی جوش میں وہ ذرا تہذیب و متانت کے طریق سے ہٹ گئے ہیں۔ مثلاً لکھا ہے :" ان کی پوری کتاب وساوس انگیزی اور دسیسہ کاریوں کا مجموعہ ہے" (ص ۱) " برنی صاحب نے اس اخلاقی کمزوری اور علمی خیانت کا ارتکاب کیا" (ص ۲)" برنی صاحب اپنا یہ مواد فاسد خارج کرلیں" (ص ۴) " اگر یہ حسن ظن صحیح ہے تب بھی حافظہ نہ باشد کی مثال غیر صادق آتی ہے" (ص ۲۲)" چہ دلاور ست دزدے کہ بکف چراغ دارد" (ص ۴۱) - اور اسی طرح کے بکثرت ذاتی حملے ہیں جنھوں نے اس کتاب کو متانت تحریر کے بلند درجے سے گرادیا ہے۔ مذہبی مباحثہ میں ہمیشہ یہ اصول پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ سخت الفاظ کے بجائے مضبوط دلائل سے اپنے مذہب کو حق ثابت کیا جائے کیونکہ کسی مذہب کی حقانیت کو الفاظ کی سختی سے نہیں بلکہ دلائل کی مضبوطی ہی سے ثابت کیا جاسکتا ہے۔ جو شخص دلائل کے بجائے الفاظ کی قوت سے کام لیتا ہے وہ درحقیقت یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کے پاس اپنے مذہب کی تائید میں کافی دلایل نہیں ہیں۔

رہا اصل مسئلہ تو اس کتاب نے برنی صاحب کے الزام کی توثیق کردی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ برنی صاحب نے مخالفانہ پہلو سے اس الزام کو پیش کیا تھا اور بشارت احمد صاحب نے موافقت کے ساتھ اسی الزام کو تسلیم کرلیا۔ برنی صاحب نے میرزا صاحب کی کتابوں سے یہی ثابت کیا تھا کہ وہ مدعی نبوت تھے۔ "تصدیق احمدیت" کے لائق مؤلف نے بھی میرزا صاحب کی تحریرات سے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ فی الواقع مرزا صاحب کا یہی دعویٰ تھا۔ انھوں نے اپنے اس عقیدے کا

اعلان کیا ہے کہ "جن لوگوں نے حضرت مرزا صاحب کے دعویٰ مسیح موعود و مہدی معہود کو قبول کیا ہے ان کو مجبوراً ان کے لوازم فضیلت اور خصوصیت نبوت کو قبول کرنا پڑے گا۔"

قادیانی مذہب از الحاج مولوی محمد الیاس برنی صاحب، استاذ معاشیات کلیہ جامعہ عثمانیہ - حیدر آباد - دکن ضخامت ۳۴۴ صفحات - ملنے کا پتہ :- کمال احمد صاحب فاروقی - بیت السلام - حیدر آباد - دکن۔

یہ قادیانی مذہب کا دوسرا ایڈیشن ہے اس میں برنی صاحب نے بہت زیادہ وسعت اور استقصاء کے ساتھ تقریباً اڑھائی سو عنوانات کے تحت مرزا صاحب اور ان کے خلفاء و متبعین کی کتابوں سے ان کی سیرت، انکی تعلیم و دعوت اور ان کے دعاوی نبوت و مہدویت و مسیحیت وغیرہ کے متعلق اقتباسات مہذب و مرتب کئے ہیں اقتباسات کی ترتیب ایسی ہے کہ پڑھنے والا خود بخود اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے جو لائق مرتب نے ان سے اخذ کیا ہے۔ عنوانات کے سوا مرتب نے اپنی طرف سے کسی رائے کا اظہار نہیں کیا ہے۔

قادیانی حساب از الحاج پروفیسر الیاس برنی صاحب - یہ بھی اسی سلسلے کا ایک مختصر رسالہ ہے جس میں قادیانی جماعت کے مختلف ٹریکٹوں کا جواب دیا گیا ہے جو "قادیانی مذہب" کی اشاعت کے بعد حیدر آباد اور بنگلور سے شائع ہوئے تھے۔

یہ دونوں رسائل پتہ بالا سے ۱ر کے ٹکٹ بھیج کر مفت طلب کئے جا سکتے ہیں۔

رسالہ حسب و نسب از حکیم محمد عثمان صاحب ضخامت ۵۰ صفحات، قیمت ۵ر ملنے کا پتہ: حکیم محمد عثمان صاحب، محلہ بیگہ، شیخپورہ، ضلع مونگیر۔

لائق مؤلف نے تحقیق و جامعیت کے ساتھ کلام اللہ اور احادیث سے حسب و نسب کی حقیقت پر بحث کی ہے، اور آجکل حسب و نسب پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں ان کے معقول جواب دیئے ہیں۔

ازبلا ضخامت ۵۲ صفحات، قیمت ۱۲ر - ملنے کا پتہ :- مینیجر اخبار الجمعیۃ، دہلی۔

الجمعیۃ میں مدتوں ایک تبلیغی افسانہ شائع ہوتا رہا ہے جو اب کتابی صورت میں طبع کیا گیا ہے - اس میں ایک

تاریخی واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ اسپین کی اسلامی حکومت کے زمانہ میں ایک پادری کی لڑکی کس طرح مسلمان ہوئی۔ مسلمان علماً کے ساتھ لڑکی اور پادریوں کے مناظرے اتنی تفصیل کے ساتھ درج کیے گئے ہیں کہ مسیحیت اور اسلام کے تقابل کا اچھا خاصہ مواد ان میں مل جاتا ہے۔ تاریخی واقعات کو افسانہ کے رنگ میں اور افسانہ کو مناظرہ کی صورت میں پیش کرنے کا یہ طریقہ خواہ فن افسانہ نگاری کے نقطۂ نظر سے کیسا ہی ہو، مگر مسلمانوں کو مذہبی معلومات بہم پہونچانے کے لیے دلچسپ اور مفید ضرور ہے۔

چراغ امین | از جناب نکہت سلطان پوری۔ ضخامت ۶۰ صفحات۔ پتہ:۔ کنور احمد اعتبار حسین خان، ہاری منو ڈاک خانہ جگدیش پور، ضلع سلطان پور۔

یہ جناب نکہت سلطان پوری کے کلام کا مجموعہ ہے، جو دو حصوں میں منقسم ہے، ایک حصہ نظموں پر اور دوسرا غزلوں پر مشتمل ہے۔ زبان اور طرز ادا پسندیدہ ہے۔

مساوات اسلامیہ | از جناب شیخ محمد صاحب قادری کاکوروی، نظیر آباد، لکھنؤ۔ ضخامت ۴۰ صفحات، قیمت ۲/

اس رسالہ میں لائق مؤلف نے مستند مآخذ سے اسلامی مساوات کی حقیقت پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ اجتماعی مشکلات کے حل میں کہاں تک اس کا دخل ہے۔

خلق عظیم | از قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم سیوہاروی۔ ضخامت ۱۲ صفحات، قیمت ۲/ ملنے کا پتہ:۔ قاضی ظہور الحسن صاحب، بمعرفت مولوی حفیظ الدین صاحب ایڈوکیٹ، محلہ عابد شاپ، حیدرآباد۔ دکن۔

اس رسالہ میں جناب ناظم صاحب نے نہایت خوش اسلوبی اور کامیابی کے ساتھ سیرت نبوی کے واقعات و روایات کو ان کے اصلی خد و خال میں نظم کیا ہے۔

قواعد

رسالۂ "ترجمان القرآن" بالعموم ہر ہجری مہینے کی ۱۰ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا۔ مہینہ کے آخر تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھ کر منگوا سکتے ہیں ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہونگی ان کو پرچہ قیمتاً دیا جائے گا۔

جو حضرات اپنی جائے قیام کسی طویل مدت کے لیے تبدیل کریں انھیں اپنے جدید پتے کی اطلاع دفتر کو بھیج دینی چاہیئے ورنہ پرچہ نہ پہونچنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیئے لیکن یہ لحاظ رہے کہ جسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

اشاعت کے لیے مضامین اور حل طلب مسائل تمام ایڈیٹر کے نام سے بھیجے جائیں لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں ہے کہ ہر چیز شائع کرے۔

منیجر ترجمان القرآن۔ خیرت آباد۔ حیدرآباد دکن

(طابع و ناشر ابو الاعلیٰ مودودی) مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن